فسانۂ غالب

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فسانۂ غالب

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Fasana-e-Ghalib
by
Malik Ram
Rs.72/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔ 110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔ 400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ 202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 | تعداد: 1100 | قیمت: -/72 روپے

ISBN : 978-81-7587-534-0 | سلسلہ مطبوعات: 1440

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد ۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی

کی نذر

بہ گنجینۂ شاہ گوہر فرستم

تعارف

یادش بخیر غالب کے بارے میں میرا پہلا مضمون نگار (لکھنؤ) کے ستمبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اگرچہ میں نے اسے لکھا اس سے چند مہینے پہلے تھا۔ اس گذشتہ نصف صدی میں بہت کچھ لکھا، لیکن صرف غالب ہی کے موضوع پر بلا مبالغہ پچاس سے زیادہ مضمون لکھے ہونگے۔ ان میں ہر طرح کے مضمون ہیں ــــــ ان کے سوانح سے متعلق، تصنیفات سے متعلق، کلام کی بعض خصوصیات سے متعلق، ان کے ممدوحین سے متعلق ــــــ غرض کہ ان کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔

پچھلے دنوں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ کم از کم وہ مضامین جن کا تعلق ان کی زندگی سے ہے، اگر انھیں ایک جلد میں شائع کر دیا جائے، تو یہ کتاب عام قاری اور غالب کا خصوصی مطالعہ کرنے والے، دونوں طبقوں کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ چونکہ 'ذکرِ غالب' کا نیا ایڈیشن شائع ہونے والا تھا، میں نے خیال کیا کہ ان مضامین کی یکجا اشاعت 'ذکرِ غالب' کے بعض مجمل بیانات کی توضیح و تشریح کے لیے بھی مفید ہوگی۔ یہ مجموعہ اسی خیال کی تکمیل کے لیے شائع ہو رہا ہے۔

یہ مضامین اگرچہ اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس مجموعے کے لیے ان پر نظرِ ثانی کے دوران میں ان میں بہت کچھ رد و بدل ہوا ہے۔ بعض مضمون تقریباً از سرِ نو لکھے گئے ہیں کیونکہ اس اثنا میں ان موضوعات پر اتنی نئی معلومات منظرِ عام پر آگئی تھیں کہ پہلا مضمون "تقویمِ پارینہ" بن کے رہ گیا تھا۔ جن حضرات نے انھیں پہلے دیکھا تھا، وہ اب ان میں بیّن فرق محسوس کرینگے۔

کتاب کا نام غالب ہی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ میرزا کی غزل کا مقطع ہے:

> بذکرِ مرگ شبی زندہ داشتن ذوقیست
>
> گرت فسانۂ غالب شنیدنیست، مخ ـ پ۔

چونکہ یہ سب مضامین کسی نہ کسی پہلو سے میرزا کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہیں، اس لیے
ظاہر ہے کہ اس سے بہتر عنوان نہیں ہو سکتا تھا۔

نئی دہلی
۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء

مالک رام

فہرست

توقیتِ غالب

۱۷۵۰ء (تقریباً) میرزا قوقان بیگ خان سلجوقی —— غالب کے دادا کی سمرقند سے ہندستان میں آمد (چندے لاہور میں قیام کیا اور اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں دلّی پہنچے اور شاہی ملازم ہو گئے۔ بعد کو اس سے مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری کر لی۔ آگرہ میں قیام)

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) / ۱۲۱۲ھ (۹ رجب) اسداللہ (بیگ) خان کی آگرے میں ولادت۔
(قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر میرزا غلام حسین خان کی بیٹی عزت النسا بیگم سے ہوا۔ یہ اسداللہ خان کے والدین تھے

۱۷۹۹ء - ۱۸۰۰ء / ۱۲۱۴ھ یوسف علی (بیگ) خان (غالب کے چھوٹے بھائی) کی ولادت۔

۱۸۰۲ء میرزا عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال۔

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار (غالب)

اسداللہ خان اور ان کے خاندان کا نصراللہ بیگ خان (عبداللہ بیگ خان کے برادرِ خُرد) کی سرپرستی میں آنا۔ (نصراللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے

قلعدار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔
اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسالدار
مقرر ہو گئے)

۱۸۰۶ء (؟ اپریل) نصراللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا اور انتقال۔
(نواب احمد بخش خان والیِ فیروزپور جھرکا و لوہارو کی ہمشیر نصراللہ بیگ خان
کے عقدِ نکاح میں تھی)

۱۸۰۶ء (۴ مئی) احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصراللہ بیگ خان کے
پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ)۔
(اس وظیفے میں نصراللہ بیگ خان کی والدہ، تین بہنیں، اسداللہ خان اور
ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی (بیگ) خان حصہ دار تھے)

۱۸۰۶ء (۷ جون) وظیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی (دوسرا شقہ) غالب کا
حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ۔
(اس شقے کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ
کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا)

۱۸۰۶ء (۲۸ نومبر) جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال۔
۱۲۲۱ھ (۱۷ رمضان) معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۱۰ء اسداللہ خان کی مولوی محمد معظم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم۔

۱۸۰۷ - ۱۸۰۸ء (تقریباً) شعر گوئی کا آغاز۔ اسد تخلص۔ چندے بعد اسے بدل کر غالب رکھ لیا۔
(ایک اور شاعر میر امانی اسد تھے۔ چوں کہ لوگ اس کا کلام ان سے منسوب

کرنے لگے تھے، انھوں نے اسد تخلص ترک کر کے اس کی جگہ غالب کرلیا)

۱۸۰۹-۱۸۱۰ء / ۱۲۲۴ھ	قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۱۰ء (۹ اگست) / ۱۲۲۵ھ (۷ رجب)	الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے دلّی میں نکاح (الٰہی بخش خان چھوٹے بھائی تھے نواب احمد بخش خان کے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی)
۱۸۱۰ء (۲۰ ستمبر) / ۱۲۲۵ھ (۲۰ شعبان)	میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۱۰-۱۸۱۱ء / ۱۲۲۶ھ	ملّا عبدالصّمد کی آگرے میں آمد (ملّا عبدالصّمد نو مسلم تھے۔ زردشتی عقائد کے زمانے میں ان کا نام ہرمز دتھا۔ وہ دو برس آگرے میں غالب کے مکان پر بطور اتالیق اور استاد رہے؛ ان کے ساتھ آگرے سے دلّی آئے اور یہیں سے رخصت ہوئے)
۱۸۱۲-۱۸۱۳ء / ۱۲۲۸ھ	غالب کی دلّی میں آمد اور مستقل سکونت
۱۸۱۷ء (۱۹ مئی) / ۱۲۳۲ھ (۳۰ جمادی الثانی)	انشا کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۲۴-۱۸۲۵ء / ۱۲۴۰ھ	مصحفی کی لکھنؤ میں وفات

۱۸۲۵ء (۹) خواجہ حاجی کا انتقال

۱۸۲۵ء (نومبر دسمبر) میرزا یوسف علی (بیگ) خان کی شدید بیماری؛ دیوانگی کا آغاز

۱۸۲۶ء
۱۲۴۲ھ الٰہی بخش خان معروف (غالب کے خسر) کا انتقال

۱۸۲۶ء (۱۳ اکتوبر) نواب احمد بخش خان کی فیروزپور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دست برداری
(نواب شمس الدین احمد خان والیِ ریاست)

۱۸۲۶ء (دسمبر) غالب کا سفرِ کلکتہ پر روانہ ہونا۔ پنشن کے مقدمے کی تیاری

۱۸۲۷ء (اکتوبر) نواب احمد بخش خان کا انتقال

۱۸۲۸ء (۲۱ فروری) غالب کا کلکتے میں ورود
۱۲۴۳ھ (۴ شعبان)

۱۸۲۸ء (۲۸ اپریل) پنشن کے مقدمے کا آغاز۔
(سرکاری درباروں میں کرسی نشینی کا آغاز۔ گلِ رعنا کی ترتیب و تدوین۔
(یہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست
مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا)

۱۸۳۰ء (۱۶ اگست) نظیر اکبرآبادی کی وفات
۱۲۴۶ھ (۲۶ صفر)

۱۸۳۱ء (۲۷ جنوری) مقدمۂ پنشن خارج
(اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے، جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا؛ لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا)

۱۸۳۵ء (۲۲ مارچ) ولیم فریزر (دتی میں انگریزوں کے ایجنٹ) کا قتل۔ کریم خان داروغۂ شکار نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری۔

(۱۸ اپریل) نواب شمس الدین احمد خان کی الزامِ قتل میں گرفتاری

(۲۶ اگست) کریم خان کو بجرمِ قتل پھانسی کی سزا

(۸ اکتوبر) نواب شمس الدین احمد خان کو بالزامِ اعانتِ مجرمانہ پھانسی
(اس پر فیروز پور جھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن، ساڑھے سات سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی)

۱۸۳۷ء (۲۹ ستمبر) معین الدین اکبر شاہ ثانی کا انتقال
۱۲۵۳ھ (۲۸ جمادی الثانی)

(۳۰ ستمبر) سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی

۱۸۳۸ء / ۱۲۵۴ھ ناسخ کا لکھنؤ میں انتقال

۱۸۳۸ء / ۱۲۵۴ھ شاہ نصیر کا حیدر آباد میں انتقال

۱۸۴۰ء	دلّی کالج میں مدرّسِ فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار
۱۸۴۱ء (اگست)	غالب کی گھر پر جوا خانہ کے قیام میں گرفتاری (عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدمِ ادائیِ جرمانہ کی صورت میں چار مہینا قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا)
۱۸۴۱ء (اکتوبر) ۱۲۵۷ھ (شعبان)	دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاخبار، دلّی) (دیوان ۱۸۳۸ء سے پہلے مرتب ہو چکا تھا)
۱۸۴۲ء۔۱۸۴۴ء	بعہدِ لارڈ ڈالن برا گورنر جنرل، خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز
۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ	میر نظام الدین ممنون کا دلّی میں انتقال
۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ	دیوان فارسی (میخانۂ آرزو سرانجام) کا پہلا ایڈیشن (مطبع دارالسلام، دلّی) (دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا)
۱۸۴۷ء (۱۳ جنوری) ۱۲۶۳ھ (۲۵ محرم)	آتش کا لکھنؤ میں انتقال
۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ	زین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے، باقر علی خان کی پیدائش
۱۸۴۷ء (مئی) ۱۲۶۳ھ (جمادی الاول)	دیوان اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دارالسلام، دلّی)

۱۸۴۷ء (۲۵ مئی) گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی گرفتاری
(فیصلے میں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی مشقت غالباً پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے قید میں رہے، اس کے بعد رہائی ہو گئی)

۱۸۴۹ء (اگست) پنج آہنگ (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دلی)
۱۲۶۵ھ (رمضان)

۱۸۵۰ء زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خان کی پیدایش
۱۲۶۶ھ

۱۸۵۰ء (۴ جولائی) تیموری خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) لکھنے پر تقرری۔ خلعت اور خطاب:
نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ
(تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپے سالانہ مقرر ہوئی)

۱۸۵۰-۱۸۵۱ء حافظ عبدالرحمٰن خان (حافظ جیو) احسان دہلوی کا دلّی میں انتقال
۱۲۶۷ھ

۱۸۵۲ء (اپریل) زین العابدین خان عارف (امراؤ بیگم کے بھانجے) کی وفات
۱۲۶۸ھ (جمادی الثانی) (عارف اپنی ادبی لیاقت کی وجہ سے غالب کو بہت عزیز تھے۔ عارف کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا تھا۔ بستی نظام الدین میں مزارِ غالب کے قریب کونے میں قبر ہے)

۱۸۵۲ء (۱۴ مئی) مومن کا دلّی میں انتقال
۱۲۶۸ھ (۲۴ رجب)

۱۸۵۳ء (اپریل) پنج آہنگ (فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دارالسلام، دلّی)

۱۸۵۴ء (۱۵ نومبر) شیخ محمد ابراہیم ذوق (استادِ ظفر) کا انتقال
۱۲۷۱ھ (۲۳ صفر) غالب استادِ ظفر

۱۸۵۴-۱۸۵۵ء مہرِ نیم روز کی طباعت و اشاعت (فخر المطابع، دلّی)
۱۲۷۱ھ

۱۸۵۶ء قادر نامہ کی اشاعتِ اول (مطبعِ سلطانی، لال قلعہ، دلّی)
۱۲۷۲ھ (یہ نظم انھوں نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی)

۱۸۵۶ء (۱۰ جولائی) غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کا انتقال
۱۲۷۳ھ (۷ ذی القعدہ)

۱۸۵۷ء (۵ فروری) غالب استادِ نواب یوسف علی خان ناظم والیِ رام پور

(۱۰ مئی) (غدر) کا میرٹھ میں آغاز

(۱۱ مئی) دیسی فوج (تلنگوں) کا دلّی میں داخلہ؛ انگریزی تسلّط کا خاتمہ؛ دیسی اقتدار کا قیام؛ غالب کی قلعے کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند

(۲۰ ستمبر) انگریزوں کی فتح اور دلّی پر دوبارہ قبضہ

۱۸۵۷ء (ستمبر) غدر کے بعد دلّی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران میں امام بخش صہبائی انگریزی
۱۲۷۴ھ (صفر)

گولی کا نشانہ ہوئے۔

۱۸۵۷ء (۱۸/۱۹ اکتوبر) میرزا یوسف علی (بیگ) خان (برادرِ غالب) کی وفات
(اگرچہ غالب نے لکھا ہے کہ ان کی وفات بخار سے ہوئی، لیکن غالباً
وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے)

۱۸۵۸ء (نومبر) دستنبو کی اشاعتِ اول (مطبع مفید خلائق، آگرہ)
(اس مختصر تحریر میں انھوں نے 'غدر' سے متعلق اپنی یادداشتیں آپ بیتی
کے انداز میں قلم بند کی ہیں)

۱۸۵۹ء (جولائی) رام پور سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) رام پور کا پہلا سفر
(وہ ایک ہفتے کے سفر کے بعد ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے تھے)

(۲۴ مارچ) رام پور سے واپسی
(میرزا ۱۷ مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے اور سات دن بعد ۲۴ مارچ
کو دلّی پہنچے)

(مئی) انگریزی پنشن کا دوبارہ اجرا
(تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے
وصول ہوا)

۱۸۶۱ء (۲۹ جولائی) دیوانِ اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دلّی)
۱۲۷۸ھ (۲۰ محرم)

۱۸۶۱ء (۱۹ اگست) مولانا فضل حق خیرآبادی کا جزیرۂ انڈیمان میں انتقال
۱۲۷۸ھ (۱۲ صفر)

۱۸۶۲ء قاطع برہان کی طبعِ اول (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
("غدر" کے زمانے میں مشہور فارسی لغات، "برہانِ قاطع" غالب کی نظر سے گزرا۔ اس پر انھوں نے جو اعتراض قلم بند کیے تھے، وہ اس عنوان سے چھپے)

(۲ مارچ) انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجرا
("غدر" کے زمانے میں غالب کا رویہ مشکوک پایا گیا تھا اس لیے ان کی پنشن اور یہ دونوں اعزاز بند ہو گئے تھے۔ تگ و دو کے بعد پنشن مئی ۱۹۶۰ء میں جاری ہوئی اور بقیہ اعزاز اب)

۱۸۶۲ء (جون) دیوانِ اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کان پور)
۱۲۷۸ھ (ذی الحجہ)

۱۸۶۳ء دیوان اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفید خلائق، آگرہ)

۱۸۶۳ء (مئی-جون) دیوان فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نولکشور، لکھنؤ)

۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ مثنوی ابر گہربار کی اشاعت (اکمل المطابع، دلّی)
(یہ مثنوی کلیاتِ نظم میں شامل تھی لیکن اب الگ سے شائع ہوئی)

۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ قاطع برہان کے جواب میں محرقِ قاطع برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلّی)

۱۸۶۴ء قادر نامہ کی دوسری اشاعت (مجتبائی پریس، دلی)

۱۸۶۵ء محرق قاطع برہان (سید سعادت علی) کے جواب میں
۱۲۸۱ھ (۱) دافع ہذیان مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری
(۲) لطائفِ غیبی از میاں داد خان سیاح
(۳) سوالاتِ عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)
(اگرچہ لطائفِ غیبی اور سوالاتِ عبدالکریم دونوں تحریریں دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں، لیکن یہ غالب کی اپنی تصنیفات ہیں)

۱۸۶۵ء (۲۱ اپریل) نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کا انتقال۔ نواب کلب علی خان کی جانشینی

(اگست) غالب کے رسالے نامۂ غالب بجوابِ ساطع برہان کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)

(۷ اکتوبر) میرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر
(میرزا ۷ اکتوبر کو دلی سے چلے اور ۱۲ اکتوبر کو رام پور پہنچے تھے)

—— دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی)
—— قاطع برہان کے جواب میں ساطع برہان مصنفہ میرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی (مطبع ہاشمی، میرٹھ)

(دسمبر) قاطع برہان کی طبع ثانی بعنوانِ درفشِ کاویانی کی اشاعت (اکمل المطابع دلی)

(دسمبر) رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی۔
(میرزا ۲۸ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے)

۱۸۶۶ء قاطع برہان کے جواب میں مؤید برہان مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتہ)
قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنفہ امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی، دہلی)

۱۸۶۷ء تیغ تیز کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)
(غالب نے یہ مختصر رسالہ مؤید برہان کے جواب میں لکھا تھا)

۱۸۶۷ء (فروری) نکات غالب و رقعات غالب کی اشاعت (مطبع سراجی، دلی)
(پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلمبند کیے)

(۱۱ اپریل) ہنگامۂ دل آشوب (۱) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ)
۱۲۸۳ھ (۵ ذی الحجہ) (قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات)

(اگست) سبد چین کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)
۱۲۸۴ھ (ربیع الثانی)

(۲۵ ستمبر) ہنگامہ دل آشوب (۲) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ)
۱۲۸۴ھ (۲۵ جمادی الاول)

(۲ دسمبر) مولوی امین الدین دہلوی مصنفِ ساطع برہان کے خلاف مقدمۂ ازالۂ حیثیتِ عرفی

۱۸۶۸ء (جنوری) کلیات نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
۱۲۸۴ھ (ربیع الثانی) (اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں، پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو شامل ہیں)

(۲۳ مارچ) مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری؛ راضی نامہ

(۱۶ جولائی) مفتی محمد صدر الدین آزردہ کا دلّی میں انتقال
۱۲۸۵ھ (۲۴ ربیع الاول)

۱۸۶۸ء (۲۷ اکتوبر) عودِ ہندی؛ مجموعۂ مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی، میرٹھ)

۱۸۶۹ء (۱۵ فروری) غالب کی وفات بستی نظام الدین؛ خاندان لوہارو کی ہڑواڑ میں تدفین
۱۲۸۵ھ (۲ ذیقعدہ) (اگرچہ بہت دن سے مختلف امراض کا شکار تھے، لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴ فروری دوپہر کو بیہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔
اب ان کی قبر پر سنگ مرمر کی چوکھنڈی بنا دی گئی ہے)

۱۸۶۹ء (۶ مارچ) اردوئے معلیٰ (مجموعۂ مکاتیبِ اردو) کی پہلی اشاعت (اکمل المطابع، دلّی)
۱۲۸۵ھ (۲۱ ذیقعدہ)

۱۸۶۹ء نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال
۱۲۸۶ھ

۱۸۶۹ء شمشیر تیز تراز مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع نبوی کلکتہ) (یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی تصنیف تیغ تیز کے جواب میں ہے جو میرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اس کی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی)

۱۸۷۰ء (۴ فروری) بیگم غالب امراؤ بیگم کا انتقال
۱۲۸۶ھ (۲ ذیقعدہ) (مزارِ غالب کی مشرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں)

۱۸۷۴ء (۲۶ جون) حکیم آغا جان عیش کا دلّی میں انتقال
۱۲۹۱ھ (۱ جمادی الاول)

۱۸۷۶ء (۲۵ مئی) باقر علی خاں (فرزندِ اکبر زین العابدین خان عارف) کا انتقال
۱۲۹۳ھ (یکم جمادی الاوّل) (شعر کہتے تھے، فارسی میں تخلص باقر تھا اور اردو میں کامل۔ مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی قاسم جانیوں کی ہڑوار میں ہے)

۱۸۸۰ء (۷ ستمبر) حسین علی خاں، زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے کا انتقال
۱۲۹۶ھ (یکم شوال) (یہ بھی شعر کہتے تھے، اردو میں شاداں تخلص کرتے تھے، فارسی میں خیالی)

تاریخِ ولادت

غالب نے اپنے اردو اور فارسی خطوں میں اپنی تاریخِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ اتنی مرتبہ لکھی ہے کہ ظاہراً کسی شخص کو اس کے بارے میں شبہہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ادھر کچھ دن سے یہ بھی متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے، اور اس کی بنیاد وہ زائچہ ہے، جو ان کے فارسی دیوان کی طبعِ دوم (لکھنؤ ۱۸۶۲۔ ۱۸۶۳ء) میں شامل ہے[1]۔ اس زائچے کی بنا پر دو "واقفکاروں" نے الگ الگ سال متعیّن کیا ہے۔ جناب صمد حسین رضوی اسے ۱۲۱۱ھ کہتے ہیں[2]، اور جناب مسلم ضیائی ۱۲۱۳ھ[3]۔

۱۲۱۲ھ کی تاریخ، غالب نے اتنے تواتر سے اپنے خطوں اور تحریروں میں لکھی ہے کہ ان کا اعادہ تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں۔ یہی نہیں، انھوں نے اس کے لیے دو تاریخیں بھی مہیّا کی ہیں۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں[4]:

غالب! چو زناسازیِ فرجام نصیب   ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب

تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس   ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظِ "غریب"

اس جگہ انھوں نے اپنی ولادت کی دو تاریخیں "شورشِ شوق" اور "غریب" لکھی ہیں، اور ان دونوں سے (۱۲۱۲) برآمد ہوتے ہیں۔

حضرت صاحب عالم مارہروی سے غالب کے جیسے ارادت اور یگانگت کے تعلّقات تھے، وہ ان خطوط سے عیاں ہیں، جو عودِ ہندی میں شامل ہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ غالب کو لکھا کہ میرا سنہ ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے یعنی سال ۱۲۱۱ھ۔ غالب نے ازراہِ تفنّن اس پر ایک عدد کا اضافہ

۱۔ کلیاتِ غالب (نظمِ فارسی): قصیدۂ نہم: مقابل ص ۱۹۹

۲۔ عیارِ غالب: ۱۲۵۔۱۶۹

۳۔ اردو نامہ (کراچی) شمارہ ۲۷: مارچ ۱۹۶۷ء (انھوں نے یہ سال "مشہور ماہرِ علمِ نجوم الحاج سید ناظر حسین شاہ زنجانی صاحب" کی سند پر لکھا ہے۔)

۴۔ کلیاتِ غالب (تقریظ): ۵۵۴

کرنے کو الف بڑھایا اور جواب میں لکھا:

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا ان کی "تاریخ"، میرا "تاریخا"

لفظ "تاریخا" سے بھی (۱۲۱۲) ہی نکلتے ہیں۔

ان کے بار بار (۱۲۱۲) کے اعادے سے کیا کسی کے دل میں یہ شبہہ رہ سکتا ہے کہ غالب کے نزدیک ان کا سالِ ولادت ۱۲۱۲ نہیں تھا! اور ظاہر ہے کہ یہ انھیں اپنے بزرگوں ہی سے روایتاً معلوم ہوا ہوگا۔ اِس صورت میں آج کوئی ہمیں بتائے کہ نہیں، سال ۱۲۱۲ غلط ہے، اس کی جگہ درست ۱۲۱۱ ہے، یا ۱۲۱۳، تو ہم یہ کیسے باور کرلیں! خاندانی روایات یوں آسانی سے نہیں جھٹلائی جا سکتیں۔ مزید براں یہ دونوں حضرات علمِ نجوم کے ماہر اور ائمۂ فن میں سے ہیں، ہم عامی تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ جو امام کی نیت، وہ مقتدی کی نیت؛ ہم ان کی رائے مان لینگے۔ لیکن پہلے یہ آپس میں تو اتفاق کرلیں کہ صحیح سال کیا ہے، (۱۲۱۱) یا (۱۲۱۳)! دونوں تو درست ہو نہیں سکتے۔

صدر میں جس زائچے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے عنوان کی عبارت ہے:

زائچۂ طالعِ ولادتِ سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقتِ شب چار گھڑی پیش از طلوعِ صبح روزِ یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۴ھ ہجری مطابق آغازِ ۱۷۹۸ء عیسوی روے دادہ۔

جیسا کہ معلوم ہے[۶]، دیوانِ فارسی کی یہ دوسری اشاعت اُس قلمی نسخے پر مبنی ہے، جو نواب ضیاءالدین احمد خان نیرّ رخشاں کی ملکیت تھا۔ یہ زائچہ اسی میں شامل ہے۔ اصلی نسخہ جس سے طبعِ ثانی کی کتابت ہوئی تھی، رضا لائبریری، رامپور کے ذخیرۂ لوہارو میں موجود ہے۔ یہ عنوان اس میں نیرّ رخشاں، کے قلم سے لکھا ہوا ہے، جیسا کہ اس پر نیرّ رخشاں کے بڑے صاحبزادے نواب سعیدالدین احمد خان طالب کی تصدیق سے ثابت ہے۔ یوں بھی نحواے عبارت سے عیاں ہے کہ یہ عبارت خود غالب نہیں لکھ سکتے تھے: کیا وہ اپنے لیے "ولادتِ سعادت مطالع" اور "مدظلہ العالی" لکھتے! اس تصریح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ اس عنوان میں بعض اغلاط ہیں، جن کے لیے غالب ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ہجری سال (۱۲۱۴) لکھا ہے، یہ تو صریحاً سہوِ کتابت ہے؛ اصلی

۵ - غالب (از مہر): ۲

۶ - دیکھیے، اردوی معلیٰ: ۲۱۵ - ۲۱۶ (بنام نیرّ رخشاں)؛ نیز ص ۹۵ (بنام بدرالدین احمد)

قلمی نسخے میں (۱۲۱۲) تھا، کاتب کو پڑھنے میں غلطی ہوئی۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو یکشنبہ نہیں تھا، چہارشنبہ تھا؛ عیسوی سال کا تطابق بھی درست نہیں، "آغازِ ۱۷۹۸ عیسوی" کی جگہ "اواخرِ ۱۷۹۷ء" چاہیے۔ یہ غلطیاں نیر رخشاں سے ہوئی ہیں۔

۱۸۶۴ء میں غالب نے تذکرۂ منظر العجائب کے لیے اپنے حالات قلمبند کیے تھے۔ اس تحریر کا عکس "احوالِ غالب" میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے آغاز میں یہ لفظ لکھے تھے: "اسداللہ خان غالب تخلص" بعد کو لفظ تخلص پر نشان دے کر انھوں نے سیدھے ہاتھ کے حاشیے پر بڑھایا: عرف مرزا نوشہ۔ پھر خیال آیا تو دوسری طرف کے حاشیے پر لکھا: "سالِ ولادت ۱۲۱۲ ہجرے"۔ یہ دونوں تحریریں خود غالب کے ہاتھ کی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کسی اور ہاتھ میں، سرخ روشنائی سے، دو اضافے کیے گئے: ۱۲۱۲ سے پہلے لکھا گیا، "۸ رجب" اور لفظ "ہجرے" کے بعد "روز یکشنبہ"۔ یہ دونوں اضافے سطر سے کچھ اوپر ہیں۔

یہ دونوں اضافے سرخ روشنائی سے لکھے گئے تھے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ غالب کی تحریر میرے پاس ہے۔ چونکہ عکس میں پوری دستاویز 'سیاہ' ہے، اس لیے قاری کو معلوم نہیں ہو سکتا اور وہ ان اضافوں کو بھی اصلی تحریر ہی کا جزو خیال کریگا؛ نیز شاید یہ بھی کہ یہ اضافہ غالب نے کیا تھا۔ اس میں "شنبہ" کا لفظ جس طرح لکھا گیا ہے، یہ غالب کی روش نہیں ہے۔ غالب اس لفظ کو 'ش' اور 'ن'، دونوں کے الگ الگ شوشوں سے لکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کی جتنی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں، ان میں یہ لفظ "شنبہ" ہی ملا ہے۔ یوں بھی اب عبارت اس طرح ہے:

سالِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری یکشنبہ؛ یہ بالکل بے تکی ہے، اور اسے غالب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اضافہ کس نے کیا؟ نیر رخشاں کی متعدد تحریریں میری نظر سے گزری ہیں، لیکن یہ الفاظ اتنے چھوٹے ہیں اور چونکہ ان کے ساتھ اور کچھ عبارت نہیں، اس لیے میں اسے ان سے منسوب کرنے میں بھی متامل ہوں۔ عین ممکن ہے کہ یہ الفاظ بطور یادداشت تذکرۂ منظر العجائب کے مرتب نے لکھے ہوں۔ چونکہ دیوان فارسی، جس میں یہ زائچہ عنوان سمیت شامل ہے، ۱۸۶۳ء میں شائع ہو چکا تھا، قرینِ قیاس ہے کہ مرتبِ تذکرہ نے اسے دیکھا ہو گا؛ اور جب اس کے پاس غالب کا یہ خود نوشت ترجمہ پہنچا، تو اس نے اسے مکمل کرنے کو یہ لفظ بڑھا دیے۔

۷- میں نے ذکر غالب (طبع چہارم ص ۲۵) میں لکھا تھا کہ یہ اضافہ غالب نے نیر رخشاں کے تتبع میں کیا؛ یہ غلط تھا۔ مزید غور سے اب میری رائے اس مضمون میں درج کی گئی ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی نے لکھا ہے کہ زائچہ ۱۸۴۸ء کے قلمی نسخۂ دیوان میں بھی ملتا ہے اور وہاں اس کے ساتھ جو عبارت لکھی ہے، اس میں بھی یومِ ولادت یکشنبہ ہی ہے۔ اس زائچے کی عبارت انھوں نے یہ نقل کی ہے:

زائچۂ طالع ولادت حضرت غالب مدظلہ العالی

ہنگام باقی ماندن چہار گھڑی ہندی از شب یکشنبہ ہشتم رجب المرجب ۱۲۱۲ھ ہجری ولادت

باسعادت رویداد

یہ عبارت بھی غالب کے قلم سے نہیں ہو سکتی؛ یہ ان کے کسی خُرد اور ارادتمند نے لکھی ہے۔ پس "یکشنبہ" کے تعیّن کی ذمّہ داری غالب پر نہیں۔ غالب صرف ایک بات جانتے ہیں، اور وہ ہے: "۸ رجب ۱۲۱۲ھ" بقیہ تفصیلات اور اصحاب نے اپنے علم پر بھروسا کر کے مہیّا کیں۔ حساب کتاب میں غالب کے علم اور واقفیت کا جو عالم تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر کسی نے ان سے کہا کہ یومِ ولادت یکشنبہ تھا، تو کوئی تعجب نہیں، اگر انھوں نے اسے تسلیم کر لیا ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ زائچہ کس نے بنایا اور کب؟

یہ متعلق ہے، کلیاتِ نظمِ فارسی کے قصیدۂ نہم سے۔ کلیات کا قدیم ترین قلمی نسخہ وہ ہے، جو ۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا، مولوی عبدالحق مرحوم کے ذاتی کتابخانے میں تھا؛ اور بگمانِ غالب اب انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتابخانے میں ہے۔ یہ قصیدہ اس خطی نسخے میں ہے؛ لیکن اس کے ساتھ زائچہ موجود نہیں ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ زائچہ اپنی موجودہ صورت میں دیوانِ فارسی طبع اول (۱۸۴۵ء) تک تیار نہیں ہوا تھا، ورنہ اسے ضرور شاملِ اشاعت کیا جاتا۔ یہ طبعِ اول کے بعد تیار ہوا ہو گا، اگرچہ بظاہر اس کا مواد اس سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھا، جیسا کہ غالب کے اس قصیدے ہی سے ثابت ہے۔

بہرحال زائچے کے عنوان میں لفظ یکشنبہ کی موجودگی کے لیے نہ غالب ذمّہ دار ہیں، اور نہ اس سے ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی تاریخ ہی غلط قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن اسی عنوان سے مولانا امتیاز علی خان عرشی کو غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے نیّرِ رخشاں کی مندرجۂ صدر دونوں غلطیوں کو درست تسلیم کر لیا؛ اور خیال کیا کہ ہو نہ ہو، غالب کی دی ہوئی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ غلط ہے، کیونکہ یہ نہ "آغازِ ۱۷۹۸ء" کے مطابق ہے، نہ اس دن یکشنبہ تھا۔ انھوں نے ان بیانات میں تطابق پیدا کرنے

۸۔ "ماہِ نو" (کراچی) جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء: ۴۴

کے لیے قیاس سے ایک تجویز پیش کی۔ لکھتے ہیں[9]:

> مرزا صاحب نے اپنی تاریخِ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے۔ نیز کلیاتِ فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے آغازِ ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے۔ ازروے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے، اور نہ یہ تاریخ آغازِ ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے۔ مختلف اہلِ علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں۔ میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخِ پیدائش ہشتم نہیں، ہژدہم رجب ہے۔ اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے، جو بقولِ غالب آغازِ سال قرار دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا، مولانا عرشی کو یہ قیاس آرائی کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انھوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ "روزِ یکشنبہ" بھی ٹھیک لکھا گیا ہے، اور "آغازِ ۱۷۹۸ء" بھی درست ہے؛ بس، اگر غلطی ہو سکتی ہے تو غالب کی بیان کردہ ہجری تاریخ میں۔ اب دیکھیے حسنِ اتفاق کا کرشمہ! اگر غالب کی بیان کردہ تاریخ پر دس دن کا اضافہ کر دیا جائے، تو یہ دونوں مفروضہ باتیں ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ چونکہ غالب کے خطوں میں تاریخ ہر جگہ ۸ رجب لکھی ملتی ہے، اس لیے عرشی صاحب کے نزدیک عین ممکن ہے کہ اصل میں یہ ۱۸ رجب تھی، کاتبوں کی مہربانی سے "۱" کا ہندسہ ساقط ہو گیا، اور یہ ۸ رجب رہ گئی۔

ان کی راے میں تاریخِ ولادت ۱۸ رجب مان لینے سے باقی دو باتیں اپنے آپ ٹھیک ہو گئیں — اس دن یکشنبہ بھی تھا، اور یہ مطابق ہے ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے، جو آغازِ سال ہے[10]!

میری پہلی شکایت تو یہ ہے کہ اگر ہم اس طرح کے قیاسات پر تاریخ و سیر کی کتابوں کی ترتیب و تدوین کرنے لگے، تو امن ہی اٹھ جائیگا، اور کوئی بات بھی یقینی نہیں رہیگی۔

۹۔ آجکل (نئی دلی)، جولائی ۱۹۶۹ء: ۳

۱۰۔ لیکن دیکھنا چاہیے کہ یہ جنتریاں بھی، جو اٹکل سے اور مرتبین کی اپنی اپنی صوابدید سے بنائی گئی ہیں، کہاں تک قابلِ اعتماد ہیں! مثلاً میرے سامنے انگریزی جنتری An Indian Ephemeris ہے۔ اس میں چار پانچ مختلف سنین کی متبادل تاریخیں درج ہیں۔ اس کے مرتب مشہور ماہرِ نجوم اور مؤرخ دیوان بہادر ل۔ د۔ سوامی کنو پلے ہیں۔ یہ کتاب اس صدی کے پہلے ربع میں حکومتِ مدراس کی طرف سے چھپی تھی۔ اس کی چھٹی جلد میں ۱۸ رجب ۱۲۱۲ھ کے مقابل ۶ جنوری ۱۷۹۸ء کی تاریخ اور دن شنبہ دیا گیا ہے۔ پس، اگر اس جنتری پر اعتماد کیا جائے، تو مولانا عرشی کی مفروضہ تاریخ کو، ۷ جنوری ۱۷۹۸ء اور یکشنبہ نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ غالب نے سب جگہ یہ تاریخ ہندسوں ہی میں نہیں دی، بلکہ لفظوں میں بھی یہی لکھی ہے۔ نواب علائی کو لکھتے ہیں[11]:

> ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

حبیب اللہ خان ذکا کو لکھتے ہیں[12]: اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہترواں برس شروع ہوا۔
غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں[13]: رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکھترواں سال شروع ہو گیا۔
غرض غالب کے نزدیک ٹھیک تاریخ ۸ رجب ہی تھی، جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنی کیونکہ ان کا ذریعۂ معلومات انھیں کی یادداشت ہو سکتی تھی۔ اور جہاں تک بزرگوں کی واقفیت اور یادداشت کا تعلق ہے، انھیں اس پر اس حد تک اصرار تھا کہ انھوں نے غالب کی زندگی کے ایک اور اہم واقعے کو اس تاریخ سے وابستہ کر دیا۔ غالب اسی محولۂ فوق خط میں علائی کو آگے لکھتے ہیں[14]:

> تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پانو میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا، اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔

اگر ۷ رجب کو ان کی زندگی کے "تیرہ برس" پورے نہیں ہوتے تھے، تو اور کونسی بات ان کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا باعث ہوئی؟ پس ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ تاریخِ ولادت ۸ رجب ہی درست ہے۔

میں تو ایک قدم اور آگے جاؤنگا۔ چونکہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کا تطابق بلحاظِ یوم و سالِ عیسوی غلط کیا گیا ہے، جس پر دیوان کا زائچہ مذکورہ مبنی ہے، لہذا یہ زائچہ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا، یہ لازماً غلط ہے۔
قصہ کوتاہ ہمیں غالب کی تاریخِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہی ماننا پڑیگی، جو ان کے خاندان کی روایت ہے۔ اس کے مقابل عیسوی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تھی، اور دن چارشنبہ (بدھ وار)

۱۱- اردوی معلی: ۲۹۵؛ خطوط غالب: ۳۷۴
۱۲- اردوی معلی: ۳۲
۱۳- عود ہندی: ۱۶۹
۱۴- ایضاً: ۲۹۵؛ نیز خطوطِ غالب: ۳۷۴

ایک فارسی خط کی تاریخ

نقلِ خط

خان صاحبانِ شفیق، مہربان خدا داد خان صاحب و ولی داد خان صاحب سلامت
از اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ، بعد سلام معلوم فرمایند کہ چوں
آں صاحبان با جناب والدہ صاحبہ قبلہ و کعبہ حضرت عزت النسا بیگم صاحبہ مدظلہا العالی[1]
ہم بطریقِ رہنِ حویلی درہم بسبیلِ دست گرداں طرحِ داد و ستد درمیان دارند و بلحاظِ
امرِ ناگزیر کہ لازمِ نفوسِ بشری است، دل جمعیِ خود ازیں جانب می خواہند، لہذا نوشتہ
می شود کہ خدائے جہان آفریں جناب بیگم صاحبہ قبلہ یعنی والدہ صاحبہ را دیر گاہ سلامت
دارد، بذاتِ خود مالکِ آں ہر دو حویلی اند، و دیگرے را در آں ہیچ گونہ شرکت و انبازی
نیست۔ و اگر احیاناً خدا نخواستہ باشد، امرِ ناگزیر کہ لازمِ ذاتِ انسان است، پیش
خواہد آمد، آں چہ از املاکِ ملوکہ و مقبوضۂ جناب ممدوحہ تبصرّفِ ایں گنہگار خواہد آمد،
وزاں مجموعہ اوّل ادائے قرضۂ آں صاحبان کردہ خواہد شد۔ و اگر ناگاہ وجہ قیمتِ آں مجموعہ بہ
ادائے قرضۂ آں صاحبان کفایت نخواہد کرد، بقیۂ قرضۂ آں صاحبان را از زرِ خود
ادا خواہم کرد۔ لیکن ایں معنی بخاطر باشد کہ چوں جناب والدہ صاحبہ نوشتن و خواندن
نمی دانند، لہذا قرار داد آنست کہ ہر تمسکِ مہریِ جناب والدہ صاحبہ کہ بے دستخطِ جنابِ ممدوحہ
خواہد بود، از پایۂ اعتبار ساقط متصور خواہد شد۔ خلاصہ ایں کہ آں صاحبان ہر زرے
کہ بجناب والدہ صاحبہ قبلہ بسبیلِ قرض دہند، تمسکِ مہریِ جنابِ ممدوحہ مزیّن بدستخطِ
جنابِ ممدوحہ حاصل کردہ نزدِ خود دارند۔ ہر تمسک کہ ایں چنیں خواہد بود، زرِ مندرجۂ
آں اگر بسببِ اتفاق بذمّۂ جنابِ ممدوحہ باقی خواہد ماند، از جنابِ ممدوحہ ادائے
آں زر، خواہ از املاکِ متروکہ خواہ از جائدادِ خاصِ خود من کل الوجوہ بذمّۂ من خواہد
بود، ہرگز دریں امر تردّد نفرمایند۔ و ایں خط را کہ من بدستِ خود، در حالتِ ثباتِ

۱۔ یہ ضمیر ان اصحاب کے لیے قابلِ توجہ ہے، جو غالب کو عربی کا بھی فاضل خیال کرتے ہیں۔ یہی غلطی انھوں نے بعد کو ایک قصیدے کے عنوان میں بھی کی ہے، جو ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں تھا۔ لکھتے ہیں:
قصیدۂ برگزیدہ در مدحِ خداوندِ روے زمیں، سایۂ جہان آفریں، حضرت قدر قدرت ملکۂ معظمۂ انگلستان خلّد اللہ ملکہ بالعدل والاحسان۔

حواس، بے جبر و اکراہ، برضاے خود، نوشتہ ام، دستاویزِ کامل شناسد۔ فقط۔
نگاشتہ سی ام جنوری ۱۸۰۴ء عیسوی

میرزا نوشہ
عرف
۱۲۳۱
اسد اللہ خان

غالب کا اصلی خط آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔
جیسا کہ ظاہر ہے، میرزا نے اسے آگرے کے دو صاحبان، خداداد خان اور دلی داد خان کے نام لکھا تھا، جن کے میرزا کی نانہیال اور ان کی والدہ سے لین دین کے تعلقات تھے؛ میرزا نے اسے لکھا بھی اسی سلسلے میں ہے۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کو یہ خط ان اصحاب کے وَرَثہ سے ملا تھا۔
اس خط کے آخر میں جو تاریخ پائی جاتی ہے، وہ بظاہر "سی ام جنوری ۱۸۰۴ء" ہے، لیکن ۱۸۰۴ء کا سال کسی عنوان ٹھیک نہیں ہو سکتا:
(۱) غالب کی پیدایش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کی ہے۔ ناممکن ہے کہ انھوں نے چھ برس کی عمر میں یہ خط لکھا ہو۔ یہ تحریر کسی چھ برس کے بچّے کی نہیں ہو سکتی۔
(۲) ۱۸۰۴ء میں وہ نابالغ تھے۔ اور کسی نابالغ کی کوئی تحریر قانونی دستاویز کے طور پر استعمال نہیں ہو سکتی۔ پس دونوں مکتوب الیہ اس سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، جو ان کا مقصود تھا؛ قانونی پہلو سے اس کا عدم اور وجود برابر تھا۔
(۳) اس خط کے آخر میں غالب کی جو مہر ثبت ہے، اس کے اندر ۱۲۳۱ھ کی تاریخ کندہ ہے، جو ۱۸۱۵-۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔ ۱۸۰۴ء کے خط پر ۱۸۱۵-۱۸۱۶ء کی تیار شدہ مہر کیونکر ثبت ہو سکتی ہے! ظاہر ہے کہ خط ۱۸۰۴ء میں نہیں، بلکہ ۱۸۱۶ء میں یا اس کے بعد لکھا گیا ہوگا۔
بعض اصحاب نے کہا ہے کہ تاریخ ۱۸۲۴ء ہوگی، جو مرورِ زمانہ سے گھس پس کے ۱۸۰۴ء بن گئی ہے۔ اس کے لیے کوئی دلیل نہیں دی گئی؛ بس یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ ۱۸۰۴ء غالباً اصل میں ۱۸۲۴ء تھا۔ بات یہ ہے کہ چونکہ ۱۸۰۴ء ناممکن تھا کیونکہ کاتب کا اس کے لکھتے وقت بالغ ہونا لازم تھا، اس لیے انھوں نے اٹکل سے ۱۸۲۴ء کہہ دیا، حال آں کہ یہ بھی غلط

ہے۔ اول تو کوئی یہ بتائے کہ آخر یہ ۱۸۲۴ء ہی کیوں ہو، ۱۸۲۴ء کیوں نہیں؟ دوسرے یہ کہ اوپر خط کا عکس دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں جو صفر ہے، وہ کسی زمانے میں بھی صفر کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا؛ یہ اول یوم بھی صفر تھا، اور آج بھی صفر ہی ہے۔ یوں بھی یہ بعید از قیاس ہے کہ (۲) کا ہندسہ کسی صورت میں بدل کر (۰) بن جائے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، جس پر ۱۸۲۴ء کی تاریخ کے مجوّزین نے غور نہیں کیا۔ اگر ہم غالب کی بڑی بہن کو نظر انداز بھی کر دیں، تو بھی غالب اپنی والدہ کے واحد وارث نہیں تھے؛ ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف بھی موجود تھے۔ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ ان سے بھی اس خط پر دستخط لیے جاتے؟ اگر ۱۸۲۴ء میں یہ خط لکھا گیا تھا، تو اس وقت میرزا یوسف کی عمر تقریباً ۲۵ برس کی ہو گی، یعنی وہ عاقل و بالغ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قرضخواہ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس خط پر ان کے دستخط کی عدم موجودگی ہی سے یہ ثابت ہے کہ یہ ۱۸۲۴ء کا نہیں۔ میرزا یوسف ۱۸۲۵-۱۸۲۶ء کے لگ بھگ پاگل ہو گئے تھے۔ لازماً یہ خط اس سے بعد کا ہو گا۔ چونکہ کسی فاترالعقل شخص کی کوئی تحریر قانونی پہلو سے قابلِ اعتنا نہیں ہوتی، اس لیے قرضخواہوں نے (اور غالب نے بھی) اس پر ان کے دستخط لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی؛ اور اکیلے غالب ہی نے بڑا بیٹا اور خاندان کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ تحریر لکھ دی۔

میں اسے ۱۸۰۴ء کی تحریر مانتا ہوں؛ اور یہی میں نے "ذکرِ غالب" میں بھی لکھا ہے[۲]۔ بشتر پرانی قلمی کتابوں اور تحریروں میں کتابت کا سال یوں لکھا ملتا ہے کہ سال کے ہندسوں کے دو ٹکڑے خاصے فاصلے سے لکھے گئے ہیں، اور سنہ کے نون کا نقطہ دونوں ٹکڑوں کے درمیان آ گیا ہے۔ مثلاً ۱۲۲۵ء لکھنا ہے، تو اسے یوں لکھیں گے: ۱۲سنہ۲۵۔ حسنِ اتفاق سے میرے پاس پنج آہنگ (غالب) کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس کا سالِ کتابت بھی ۱۸۰۴ء ہے، اور یوں لکھا ہے: ۱۲سنہ۰۴۔ پس، زیرِ بحث خط کی تاریخ میں جو نقطہ (۱۸۰۴) میں ہے، یہ سنہ کی نون کا نقطہ ہے، نہ کہ تاریخ کا جُزو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو (۴) کے ہندسے کے بعد مٹے ہوئے صفر کا

۲- ذکرِ غالب : ۲۴

مدھم سا نشان اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے جب یہ خط پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں دیکھا ہے، تو اس وقت یہ آخری صفر اتنا مغشوش نہیں تھا، جتنا اب ہے، بلکہ اس سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس خط کو ۱۸۴۰ء کا لکھا ہوا مانتا ہوں۔

میرے اس خیال کی تائید میں ایک اور بات بھی ہے، جس کا تعلق درایت سے ہے۔ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خان کی وفات ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ جیسا کہ معلوم ہے، غالب صرف تین بھائی بہن تھے۔ بہن غالباً ان سے دو برس بڑی تھیں اور بھائی یقیناً دو برس چھوٹے۔ گویا کم و بیش چار پانچ برس میں یہ تینوں بچے پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں شادیاں عموماً کم عمری میں ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ میرزا عبداللہ بیگ خان کا نکاح سنِ بلوغ کے بعد ہوا ہو گا، جب بھی وہ وفات (۱۸۰۲ء) کے وقت تیس سے زیادہ کے نہیں رہے ہوں گے۔ ان کی بیوی (یعنی غالب کی والدہ) کو یقیناً ان سے کم عمر ہونا چاہیے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ۱۸۰۲ء میں ان کی عمر شاید ۲۵ کے قریب ہو گی۔

جو خط زیرِ بحث ہے، اس قسم کی تحریریں بالعموم اس وقت حاصل کی جاتی ہیں، جب شخصِ مذکور بہت سالخوردہ یا ضعیف یا خطرناک حد تک بیمار ہو جاتا ہے۔ بتقاضاے بشری داد و ستد کرنے والے اشخاص کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ کیا معلوم یہ کب چل بسے! اور کون جانتا ہے، اس کے بعد اس کے ورثہ اس کے قرضوں کی تصدیق کریں یا نہیں۔ پس، وہ پیش بندی کے طور پر ورثہ سے اس طرح کی دستاویز یا اقرار نامہ لکھوا لیتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی وفات کی صورت میں اس کے تمام مالی واجبات اور لین دین کے معاملات کے لیے ورثہ اپنی ذمہ داری اور رضامندی کا پیشگی اقرار کر لیں، تاکہ بعد کو کسی قسم کی پیچیدگی نہ پیدا ہو۔ اس خط کی بھی یہی صورت ہے۔ اس کی پوری فضا ایک قانونی دستاویز کی سی ہے۔ عین ممکن ہے کہ میرزا نے یہ خط خود قرضخواہوں کے مسودے یا ان کے کسی قانونی مشیر کی ہدایت کے مطابق قلمبند کیا ہو۔

میں نے اوپر میرزا کے والدین کی عمر کا جو اندازہ پیش کیا ہے اس کے مدِ نظر ۱۸۰۲ء میں عزت النسا بیگم کی عمر ۲۵ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ گویا ۱۸۲۴ء میں وہ ۴۷ برس کی اور ۱۸۴۰ء میں ۶۳ برس کی ہوں گی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۸۴۰ء میں حالات کے وہ صورت اختیار کر جانے کے امکانات کہیں زیادہ ہیں، جن کے پیشِ نظر قرضخواہوں کو میرزا سے

یہ خط لکھوانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

غرض جہاں تک اس خط کی تاریخ کا تعلق ہے، میرا اعتقاد یہی ہے کہ یہ ۱۸۴۰ء میں لکھا گیا تھا۔ اس سے ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ اس خط کی تاریخِ تحریر (۳۰ جنوری ۱۸۴۰ء) تک غالب کی والدہ زندہ تھیں۔

اب یہی مسئلہ ایک اور پہلو سے دیکھیے:

میرزا کے جو اردو خطوط ہم تک بحفاظت پہنچے ہیں، ان میں سب سے پرانے خط (بنام منشی نبی بخش حقیر) کی تاریخ ۹ مارچ ۱۸۴۸ء ہے[۳]۔ اور اس کے بعد کے خطوط کم و بیش مسلسل دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ محض اتنی سی بات پر بھروسا کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ان کی والدہ کا انتقال ۱۸۴۸ء میں یا اس کے بعد ہوا ہوتا، تو وہ کسی نہ کسی مکتوب الیہ کے خط میں ضرور اس کا ذکر کرتے۔ لیکن ان کے کسی خط میں اس طرح کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس سے لازماً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کا ۱۸۴۸ء سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ بلکہ زیرِ بحث خط کے جو الفاظ ہیں، ان سے مجھے قوی شبہہ گزرتا ہے کہ ان دنوں وہ سخت بیمار تھیں اور اسی لیے یہ خط لکھنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس خط کے یہ جملے: "بلحاظِ امرِ ناگزیر کہ لازمِ نفوسِ بشری است"، نیز "اگر احیاناً، خدا نخواستہ باشد کہ، امرِ ناگزیر کہ لازمِ ذاتِ انسان است، پیش خواہد آمد" اسی حقیقت پر دال ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے، تو پورا خط اسی پس منظر کا واضح ثبوت ہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ اسی زمانے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

بےمحل نہیں ہوگا، اگر یہاں ایک اور خط کا بھی ذکر کر دیا جائے، یہ انھوں نے دسمبر ۱۸۵۲ء میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں[۴]:

> بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا، یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اوس کو ماں سمجھا تھا، اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے: تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اوس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اوس کے مرنے

۳- ابھی چند دن ہوئے، غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط کا ایک مجموعہ نظر سے گزرا۔ اس میں چند اردو خطوط بھی ہیں۔ سب سے پرانا ۱۸۴۶ء کا ہے۔

۴- خطوطِ غالب: ۱۳۵-۱۳۶

سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یکبار مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔
سوال ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس خط میں انھوں نے والدہ کا ذکر نہیں کیا، تو کیا وہ اس وقت زندہ تھیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ آپ غور فرمائیں، تو دیکھینگے کہ یہاں انھوں نے پھوپھی کی مناسبت سے صرف دادھیالی رشتے دار گنائے ہیں، ان میں ننھیال کے کسی شخص کا ذکر نہیں ہے۔ پس، میرے خیال میں اس سے ان کی والدہ یا ننھیالی عزیزوں کے بارے میں کوئی استنباط کرنا درست نہیں ہوگا۔
الغرض میرا یقین ہے کہ میرزا کا یہ خط ۱۸۴۰ء میں لکھا گیا تھا اور غالباً ان کی والدہ کا انتقال بھی اسی زمانے میں یا اس کے جلد بعد ہو گیا۔

میرزا یوسف

میرزا غالب کے اپنے گھر کے گنتی کے تین آدمی تھے۔ ایک بہن چھوٹی خانم، جو عمر میں ان سے غالباً دو تین برس بڑی ہوں؛ اور ایک بھائی میرزا یوسف علی بیگ خان، جو ان سے دو برس چھوٹے تھے! چونکہ میرزا کی ولادت دسمبر ۱۷۹۷ء کے اواخر میں ہوئی۔ اس لیے میرزا یوسف کہیں ۱۷۹۹ء کے آخر یا ۱۸۰۰ء کے شروع میں پیدا ہوئے ہونگے۔

میرزا یوسف بھی غالب کی طرح اس پنشن میں حصۂ رسدی کے حقدار قرار دیے گئے تھے، جو فخر الدولہ نواب احمد بخش خان رئیسِ لوہارو نے جون ۱۸۰۶ء میں ان کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان کی وفات پران کے پس ماندگان کے لیے انگریزی حکومت کی طرف سے منظور کرائی تھی۔ پورے خاندان کے لیے پانچ ہزار سالانہ مقرر ہوئے تھے۔ ان میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کو ملے، ڈیڑھ ہزار میرزا نصر اللہ بیگ خان کی والدہ اور تین بہنوں (یعنی غالب اور میرزا یوسف کی دادی اور پھوپیوں) کو ملا، اور پندرہ سو ان دونوں بھائیوں کے حصے میں آیا۔ اس میں سے نصف یعنی ساڑھے سات سو میرزا غالب کو ملے، اور ساڑھے سات سو میرزا یوسف کو۔[۲]

میرزا غالب کے خاندان میں سو پشت سے سپہ گری کا پیشہ چلا آرہا تھا؛ ان لوگوں نے اپنی کتابِ زندگی میدانِ کارزار میں خون کے حرفوں سے لکھی۔ خود ان کے والد اور چچا کا انتقال میدانِ جنگ میں ہوا۔ غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خان بھی فوج میں کمیدان رہے تھے۔ پس ان حالات میں ظاہرا کوئی وجہ نہیں تھی کہ کیوں یہ دونوں بھائی بھی اپنے آبا و اجداد کے

۱۔ کلیاتِ نثرِ غالب (فارسی): ۳۹۳
۲۔ ذکرِ غالب (طبع پنجم): ۳۲-۳۳

نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فوجی پیشہ نہ اختیار کرتے! لیکن غالب نے خاندانی نیزہ طاق پر رکھ دیا، اوراس کی جگہ قلم ہاتھ میں لے لیا۔ اس میدان میں بھی انھوں نے کیا کیا معرکے سر کیے اور کون کون سی فتوحات حاصل کیں، کون ان سے آگاہ نہیں!

میرزا یوسف نے بڑے بھائی کے برعکس خاندانی روایت کی تقلید کی اور فوج میں ملازم ہوگئے۔ یہ مہاراجا چندولال کے زمانے میں حیدرآباد دکن کی "افواجِ قاہرہ میں نہایت مقتدر عہدے پر سرفراز تھے"[۳] ان سے پہلے ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ خان بھی آصف جاہ ثانی نظام علی خان کے زمانے (۱۷۶۱ء - ۱۸۰۳ء) میں حیدرآباد کی فوج میں ملازم رہے تھے[۴]۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ پرانے تعلقات ملازمت حاصل کرنے میں میرزا یوسف کے کام آئے ہونگے۔ میرزا یوسف یہیں حیدرآباد میں تھے کہ بقول نواب سرور الملک "کسی دشمن نے (ان پر) ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلادی کہ وہ مجنون ہوگئے اور تا وقتِ انتقال مجنون رہے[۵]۔" یہ ۱۸۲۶ء یا اس سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ جب اس سال اگست کے لگ بھگ میرزا غالب اپنی پنشن کے لیے چارہ جوئی کرنے کو دلی سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے ہیں، تو میرزا یوسف پر اس سے پہلے جنون کا حملہ ہوچکا تھا[۶]۔ میرزا غالب دستنبو میں میرزا یوسف کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں[۷]:

دریغ آں کہ اندرونگِ سہ بیست (۲۰) سہ دہ شاد وسی (۳۰) سال ناشاد زیست

دوسری جگہ لکھا ہے[۸]: درسی سال خرد بباد داد۔

ان بیانات سے خیال ہوتا ہے کہ دیوانگی کے آغاز میں میرزا یوسف کی عمر ۳۰ برس کی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۲۶ء میں وہ کسی طرح ۲۸ برس سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے۔

ان کا نکاح غالباً اس سے پہلے ہوچکا تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خان نیرّ رخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم (عرف بگا بیگم) نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کا نکاح ایک مغلوں کے خاندان میں ہوا تھا، جو فراش خانہ (دلی) میں مقیم تھا۔ ان کے خسر کا نام معلوم نہیں ہو سکا، البتہ ان کی بیوی

۳۔ کارنامۂ سروری: ۱۹
۴۔ اردوی معلی: ۲۶ (بنام حبیب اللہ خان ذکا)
۵۔ کارنامۂ سروری: ۱۹
۶۔ کلیات نثرِ غالب: ۱۰۳ (بنام میر اعظم علی مدرس مدرسۂ اکبرآباد)
۷۔ ایضاً: ۳۹۸
۸۔ ایضاً: ۳۹۳

کا نام لاڈو بیگم تھا - اولاد میں صرف ایک لڑکی عزیزالنساء بیگم ہوئی ۔
غالب نے بھائی کے نکاح کے موقع پر احباب کو دعوت کا رقعہ فارسی میں بھیجا تھا ، ملاحظہ ہو[9]:

خجستہ انجمنِ طوے میرزا یوسف | قرار یافت دریں مہ، بحکمِ ربِ ودود
دوشنبہ بست و دوم روز از مہ شعبان | دمے کہ مہر نہد سوے قبلہ سر بسجود
کرم کنند و فزایند زیبِ بزمِ نشاط | بہ فرّ فرخِ فرخندگی فزاے ورود
بسر برند شب اینجا کہ تا سفیدۂ صبح | ہمیں نظارۂ رقص است و استماعِ سرود
سپیدہ دم کہ ز فیضِ شمولِ نکہتِ گل | دم نسیم سحر مشکبار خواہد بود
شوند جانبِ کاشانۂ عروس رواں | بہ شادمانیِ بخت مبارک و مسعود
سپس بہمرہی صبح وقتِ برگشتن
سپاسِ بندہ نوازی ہمی تواں افزود

خجستہ انجمنِ طوے میرزا یوسف	قرار یافت دریں مہ، بحکمِ ربِ ودود
دوشنبہ بست و دوم[10] روز از مہِ شعبان	دمے کہ مہر نہد سوے قبلہ سر بسجود
کرم کنند و فزایند زیبِ بزمِ نشاط	بہ فرِّ فرخِ فرخندگی فزاے ورود
بسر برند شب اینجا کہ تا سفیدۂ صبح	ہمیں نظارۂ رقص است و استماعِ سرود
سپیدہ دم کہ ز فیضِ شمولِ نکہتِ گل	دمِ نسیمِ سحر مشکبار خواہد بود
شوند جانبِ کاشانۂ عروس رواں	بہ شادمانیِ بختِ مبارک و مسعود
سپس بہمرہیِ صبح وقتِ برگشتن	سپاسِ بندہ نوازی ہمی تواں افزود

اس قطعے سے معلوم ہوا کہ احباب کو پیر کے دن، ۲۲ شعبان کو بوقتِ شام تشریف لانے اور رات دولھا کے مکان پر قیام کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ مہمانوں کی تفریح و انبساط کے لیے رات بھر رقص و سرود کی محفل گرم رہی تھی ۔ اگلی صبح (۲۳ شعبان) برات دلھن کے مکان پر

---

۹ - اگرچہ یہ قطعہ باغ دو در میں بھی شامل ہے، لیکن میرے پاس ایک بیاض ہے، جہاں سے میں نے اسے نقل کیا ہے اور جس کا عکس بھی اس مضمون کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس تحریر میں پہلے تین اشعار خود میرزا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ۔

۱۰ - باغ دو در: طراز

۱۱ - ایضاً: دویم

گئی اور غالباً اسی دن واپس آ گئی ؟!

دلّی میں شادی ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ شادی میرزا غالب کے مستقل طور پر دلّی آجانے کے بعد ہوئی ہوگی۔ میرے اندازے کے مطابق میرزا ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲ - ۱۳-۱۸ء) میں دلّی آئے تھے[13]۔ اور گمانِ غالب ہے کہ میرزا یوسف بھی انھی کے ساتھ آئے ہوں گے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔

ممکن ہے کہ میرزا یوسف شروع میں بھائی ہی کے ساتھ رہے ہوں۔ لیکن شادی کے بعد ضرور الگ رہنے لگے ہوں گے۔ خاندانی پنشن میں سے انھیں بھی ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے، کھانے والے ایک آپ، ایک بیوی اور ایک لڑکی۔ اتنے مختصر خاندان کے لیے یہ رقم زیادہ نہیں، لیکن اگر اللّوں تلّلوں کی عادت نہ ہو، تو اس زمانے کی معیشت پر نظر رکھتے ہوئے، اُجلے خرچ کے لیے یہ کچھ کم بھی نہیں تھی۔

دونوں بھائیوں کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ غالب کے اردو کلام میں ایک شعر بھی ان سے متعلق ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف بیمار ہو گئے تھے اور بیماری ظاہراً تشویشناک صورت اختیار کر گئی۔ جب خدا نے انھیں صحت دی، تو غالب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا:

---

۱۲ - جنتری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ۲۲ شعبان کو پیر کا دن ۱۲۳۸ھ اور ۱۲۴۳ھ میں پڑتا ہے۔ ۱۲۳۸ھ میں میرزا یوسف ۲۴ برس کے تھے اور ۱۲۴۳ھ میں کوئی تیس برس کے۔ ۲۴ کی عمر میں شادی ہونا مستبعد تو نہیں۔ لیکن اس زمانے کے رواج اور خود غالب کی عمر شادی کے وقت دیکھتے ہوئے، ۲۴ برس کی عمر بہت زیادہ ہے، اور تیس کی تو خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ میرا خیال ہے کہ شادی ضرور ۲۴ سے کم کی عمر میں ہو گئی ہوگی۔ جنتری میں ۱۲۲۹ھ میں ۲۲ شعبان منگل کی لکھی ہے، ۱۲۳۰ھ میں اتوار کی، ۱۲۳۲ھ میں پھر منگل کی اور ۱۲۳۵ھ میں بھی اتوار کی، موجودہ بلے بلے زمانے کی جنتریاں بہت بعد کو مرتب ہوئیں۔ اس لیے یہ تاریخیں اور دن محض حسابی باتیں ہیں۔ اس وقت ہم عصر لوگوں نے چاند دیکھ کر مہینے اور تاریخ کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ان اتوار اور منگل کے دنوں میں سے کوئی وہ ۲۲ شعبان ہو، جس دن غالب کے زمانے میں دوشنبہ کا دن آپڑا تھا اور جس دن میرزا یوسف کی شادی کے لیے مہمان بلائے گئے تھے۔

۱۳ - ذکر غالب: ۳۳ - ۳۴

میرزا یوسف ہے، غالب! یوسف ثانی مجھے — دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

غدر (۱۸۵۷ء) کے دوران میں میرزا غالب کی سکونت بلی ماران میں تھی۔ بگا بیگم کی روایت ہے کہ ان ایام میں میرزا یوسف سرس کی گلی میں مقیم تھے۔ یہ فراشخانہ اور کھاری باؤلی کے درمیان الٹے ہاتھ پر نئے بانس سے ملی ہوئی ایک پتلی سی گلی ہے۔ اس میں گنتی کے چند مکان ہیں۔ شہر کے ہولناک حالات کے پیشِ نظر ان کی بیوی (لاڈو بیگم)، اپنی بیٹی (عزیز النسا بیگم) اور نواسے نواسیوں کو ساتھ لے کر جیپور چلی گئی تھیں۔ میرزا یوسف کے پاس اس زمانے میں صرف ایک بوڑھا ملازم اور بڑھیا ماما تھی۔ میرزا غالب بھائی کی تنہائی اور اس سے اپنی جدائی اور اس کے حالات سے بیخبری کے باعث بہت متشوش اور فکر مند تھے، لیکن شہر کی جو مخدوش حالت تھی، اس کے پیشِ نظر وہ بلی ماروں سے فراش خانے تک جانے اور انھیں اپنے ساتھ لوا لے جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دستنبو میں لکھتے ہیں:[۱۴]

برادر کہ دو سال از من کوچک است، در سی سال خود باد داد و دیوانگی و کالیوگی گزید۔ سی سال است تا کہ آں دیوانۂ کم آزار بیخروش مست و بے ہوش می زید۔ خانۂ وے از خانۂ من جدا است و کما بیش دوریِ دو ہزار گام درمیان۔ زن و دخترش با فرزنداں و کنیزاں زندگی در گریختن پنداشتند۔ و خانہ خداوندِ دیوانہ را با خانہ و کالا و دربانے کہن سال و کنیزے پیرزال بجا گذاشتند۔ کس فرستادن و آں سہ تن و کالا را بدیں جا آوردن، اگر جا دو دانستمے، نتوانستمے۔ این خود گرانِ اندوہے دیگر.... من ہمہ در بندِ آنم کہ برادر شب چوں خفت و بروز چہ خورد و نا آگہی بداں پایہ کہ نمی توانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مرد:

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم — من و جان آفریں کہ جاں بلبم

ستمبر ۱۸۵۷ء میں شہر پر انگریزی فوج نے دوبارہ قبضہ کر لیا، تو یہاں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ دار و گیر کا وہ بازار گرم ہوا کہ الحفیظ، الامان! شہر میں فوجی قانون (مارشل لا) نافذ ہو گیا۔ سپاہی لوگوں کے گھروں میں بے تحاشا در آتے اور جسے چاہتے، محض شبہے کی بنا پر گرفتار کر لے جاتے، یا کھڑے کھڑے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ ایک دن غالب کو اطلاع ہوئی کہ ۲۰ ستمبر

۱۴۔ کلیاتِ نثر فارسی: ۳۹۳۔ نیز اس سلسلے میں دیکھیے، اردوئے معلیٰ: ۲۵۵ (بنام یوسف میرزا)

جمعرات کے دن گورے میرزا یوسف کے مکان میں بھی گھس آئے تھے۔ اگرچہ انھوں نے گھر بھر میں جھاڑو پھیر دی، لیکن میرزا یوسف اور دونوں ملازموں سے تعرض نہیں کیا۔ اس پکڑ دھکڑ میں حسنِ اتفاق سے کہیں سے دو ہندو اس گلی میں آ گئے، انھوں نے ان بیچاروں کی بہت مدد کی اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔[15] آخر ایک دن خبر آئی کہ "دِوانے" نے موت پائی۔ لکھتے ہیں[16]:

نوزدہم اکتوبر[17]، ہماں دوشنبہ کہ نامش از سیاہی روزہا ے ہفتہ ہمی باید سترد، بادِ چوں اژدر آذرفشاں جہاں را در خویش فرو برد۔ ہمانا در پاسِ نخستینِ آں روز دربانِ دژم رُوے، ژولیدہ موے، مژدۂ مُردنِ برادر آورد۔ می گفت کہ آں گرم روِ راہِ نیستی پنج روز بھدیِ تپ سوزندہ ماند و شبا ہنگام در دلِ شب توسن ازیں تنگنا جہاند۔

میرزا غالب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف کا انتقال بہ عارضۂ بخار ہوا۔ اس کے برخلاف لوہارو خاندان کی روایات کے مطابق وہ انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے، نواب احمد بخش خان رئیسِ لوہارو کے والد میرزا عارف جان تین بھائی تھے، دوسرے دونوں کے نام قاسم جان اور عالم جان تھے۔ قاسم جان کے تین بیٹے ہوئے: محمد بخش خان اور قدرت اللہ بیگ خان اور فیض اللہ بیگ خان۔ قدرت اللہ خان ہی کی بیٹی امتیاز زمانی بیگم (عرف حاجی بیگم) نواب ضیاء الدین احمد خان، نیر رخشاں کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ قدرت اللہ خان کے ایک بیٹے کا نام معین الدین حسن خان تھا۔ زین العابدین خان عارف کے والد غلام حسین خان مسرور، دوسرے بھائی میرزا فیض اللہ خان کے بیٹے تھے۔

میرزا معین الدین حسن خان غدر کے زمانے میں علاقۂ پہاڑ گنج (دلّی) کے تھانیدار تھے۔ چونکہ اس ہنگامے میں وہ بھی کسی حد تک انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں شریک رہے تھے، اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی قبضے کے بعد وہ کہیں گرفتار ہو گئے ہوتے، تو ضرور لقمۂ اجل

۱۵۔ کلیاتِ نثر فارسی: ۳۹۵
۱۶۔ ایضاً: ۳۹۸
۱۷۔ سنہ ۱۸۵۷ء

ہو جاتے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ نکلے اور بہت پریشان حالی اور ہرزہ گردی کے بعد، اپنے خاندان کے متعدد دوسرے افراد کی طرح وہ بھی حیدرآباد میں مقیم ہو گئے۔ یہیں ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء کو صبح کے وقت اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر محلہ چنچل گوڑہ میں حضرت عباداللہ شاہ کے چبوترے پر مغرب کی جانب ہے۔

اس تفصیل کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ میرزا معین الدین حسن خان نے غدر کے حالات پر مشتمل ایک کتاب "خدنگِ غدر" کے نام سے لکھی تھی، خواجہ حسن نظامی نے "غدر کی صبح شام" کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے، اس کا پہلا حصہ "خدنگ غدر" کا ترجمہ ہے۔

میرزا معین الدین حسن خان لکھتے ہیں[18]:

> میرزا یوسف برادرِ خوردِ میرزا اسداللہ خان غالب کہ قدیم سے مجنون تھے، حالتِ جنون میں گھر سے باہر نکل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے۔ اور کئی آدمی آبرودار، نامی اس ہنگامۂ جرنیل میں معرضِ قتل میں آ گئے۔ شانِ غضبِ الٰہی کا ظہور تھا، خطادار اور بیخطا برابر تھے، گیلی سوکھی سب جلتی تھی۔

گویا میرزا معین الدین حسن خان کے نزدیک میرزا یوسف کا انتقال بخار سے نہیں ہوا، جیسا کہ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے، بلکہ وہ انگریز کی گولی سے جان بحق ہوئے۔ یہی بات بگا بیگم نے بھی کہی ہے، اگرچہ انھوں نے اتنی صراحت نہیں کی۔ لیکن جب وہ کہتی ہیں[19]: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے" تو "مارے گئے تھے" کی کوئی اور توجیہ نہیں ہو سکتی۔

آخر غالب کے اور ان دونوں کے بیانات میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ گمانِ غالب یہ ہے کہ یہاں غالب نے جان بوجھ کر حقیقت کے خلاف لکھا ہے۔ اصل بات وہی ہے، جو معین الدین حسن خان اور بگا بیگم نے کہی، یعنی میرزا یوسف انگریز کی گولی کا شکار ہوئے تھے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ دستنبو نہ غدر کی تاریخ ہے، نہ میرزا کا روزنامچہ۔ اس مختصر رسالے میں انھوں نے جستہ جستہ وہ واقعات قلم بند کیے ہیں، جو ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے دوران میں یا تو خود انھیں پیش آئے، یا انھوں نے دوسروں سے سنے۔ خدا معلوم اس رسالے کو "اپنے بہت سے

۱۸۔ خدنگِ غدر: ۳۸۔ نیز غدر کی صبح شام: ۸۸

۱۹۔ احوال غالب: ۸۷

مطالب کے حصول کا ذریعہ[20]، بنانے کا خیال کب ان کے ذہن میں آیا؛ لیکن جب بھی آیا ہو، یقینی بات ہے کہ اس کے بعد وہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں لکھ سکتے تھے، جو ان کے انگریز ممدوحین کی طبعِ نازک پر گراں گزرتی۔

دستنبو آگرے میں چھپی تھی۔ غالب نے تفتہ کو لکھا کہ اس کی چھپائی کا انتظام کیا جائے، اور پھر جب بےصبری سے شور مچایا کہ یہ کام جلدی کرو، تو تفتہ نے کہیں لکھا ہوگا کہ، صاحب! آخر آپ کو کتاب کے چھپوانے میں اتنی عجلت کیوں ہے؟ کتاب چونکہ غدر کے حالات سے متعلق ہے، اس لیے جب تک صاحبِ مطبع اپنا اطمینان نہ کرلے کہ کتاب کیسی ہے اور کہیں اس کے چھاپنے پر حکومت کا عتاب تو اس پر نازل نہیں ہو جائیگا، وہ کیسے اسے چھاپ دے، تو انھیں جواب میں لکھتے ہیں[21]:

> اُس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجونگا اور ایک جلد بذریعہ اون کے جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی نذر کر دونگا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔ (میں نے جن الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیا ہے، یہ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔)

خاندانی روایات بہت سخت جان ہوتی ہیں، یہ سینہ بسینہ صدیوں تک زندہ رہتی ہیں، اور یہاں تو بھولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ غرض، دونوں راوی (معین الدین حسن خان اور بگا بیگم) اس واقعے کے وقت موجود تھے۔ معین الدین حسن خان بالغ و عاقل تھے۔ بگا بیگم کچھ ایسی بڑی نہیں تھیں، ان کی عمر یہی چھ سات برس کی ہوگی (ولادت: ۱۸۵۱ء)۔ لیکن انھوں نے یقیناً یہ بات گھر ہی میں سنی ہوگی۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان دونوں شہادتوں پر شبہہ کریں۔ بات وہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ میرزا غالب نے مصلحۃً حقیقت پر پردہ ڈالا اور یہ نہ لکھا کہ وہ انگریز کے ہاتھ سے مارے گئے، تاکہ ان کے خداوندانِ مجازی جنھیں وہ یہ کتاب نذر کرنے والے تھے، کہیں اس سے ناراض نہ ہو جائیں۔

۲۰۔ اردوی معلیٰ: ۳۷؛ نیز خطوط غالب: ۸۰۳ (بنام تفتہ)

۲۱۔ اردوی معلیٰ: ۴۱؛ خطوط غالب: ۸۰۵ (بنام تفتہ)

غالب کو جب بھائی کے انتقال کی خبر ملی، تو اب دوسرا مرحلہ ان کی تجہیز و تکفین کا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ خود اکیلے جا نہیں سکتے، موت قدم قدم پر ان کا راستہ روکے کھڑی ہے؛ لیکن لاش کو یوں لاوارث چھوڑ دینا بھی ناممکن تھا۔ لکھتے ہیں[۲۲]:

از آب و آب چین بگزر د مردہ شوے دگور کن مجوے۔ از سنگ و خشت مپرس و از آرہ و آزندہ مگوے و بگوے کہ چگونہ ردم و کجا برم و در کدام گورگاہ بخاک سپرم۔ از پرنیاں و دیبا تا کرپاس نازیبا، ہیچ چیز در بازار نمی فروشند، مزدورانِ زمین کنندہ بہ بیل و کلند کار کنندہ، گوئی ہیچ گاہ در شہر نبودہ اند۔ ہندو ہمی تواند کہ مردہ را بدریا برد و برلبِ آب در آتش سوزاند۔ مسلماناں را چہ زہرہ کہ دو سہ کس ہم پایے یک دگر دوشادوش براہے گزرند، چہ جائے آنکہ مردہ را از شہر بردن برند۔ ہمسایگاں بر تنہائیِ من بخشودند و بسرانجامِ کار کمر بستند۔ یکے را از سپاہیانِ پٹیالہ پیشاپیش و دو تن را از چاکرانِ من باخویش گرفتند و رفتند و تنِ مردہ شستند و در دو سہ چادرِ سپید کہ از پیچارہ بودند، بپیچیدند و بہ نمازگاہے کہ بہ پہلوے آں کاشانہ بود، زمین کندند، و مردہ را دراں جا نہادند، و مغاک بخاک انباشتند و برگشتند۔

غالب نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے مکان کے پہلو کی مسجد میں گڑھا کھودا اور لاش اس میں دفن کر دی۔ بگا بیگم کا بھی یہی بیان ہے[۲۳] کہ "مسجد تہوّر خان میں دفن ہوئے" تھے۔ بات ایک ہی ہے کیونکہ یہ مسجد نیا بانس کے متصل، سربازار، سرس کی گلی کے نکڑ پر ہے۔ اسے عہدِ محمد شاہی کے امیر تہوّر خان تاشکندی رئیسِ شاہجہان پور نے تعمیر کرایا تھا[۲۴] اس لیے یہ نام پڑا۔ اب مسجد کی شکل بہت بدل گئی ہے۔ اس ردّ و بدل میں میرزا یوسف کی قبر کا نشان بھی مٹ گیا۔

غالب نے بھائی کی وفات پر جو چند شعر کہے تھے، ان سے ان کے دردِ دل کا اظہار ہوتا ہے، کہتے ہیں:

۲۲- کلیات نثر فارسی: ۳۹۸

۲۳- احوال غالب: ۸۷

۲۴- واقعات دار الحکومت دہلی ۲: ۳۱۰-۳۱۱

دریغ آں کہ اندر درنگِ سہ بیست (۶۰) | سہ دہ شاد وسی سال ناشاد زیست (۳۰) (۳۰)
تہِ خاک بالیں زخشتش نبود | بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا! بریں مردہ بخشایشے | کہ نادیدہ در زیست آسایشے
سرِ و شے بدلجوییِ او فرست | روانش بجا دید مینو فرست

میرزا یوسف کا انتقال ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو ہوا تھا۔ غالب نے بہ صنعتِ تخرجہ قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف | کہ زیستے بجہاں، در زخویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمی پژوہش کرد | کشیدم "آہے" گفتم "دریغ دیوانہ"

۱۶ (۱۲۷۴=۱۶-۱۲۹۰)

جب تک میرزا یوسف زندہ رہے، مہینے کے مہینے ان کی پنشن کے ساڑھے باسٹھ آجاتے اور لاڈو بیگم اس قلیل معاش میں اپنا اور اپنے شوہر کے کھانے پینے کا انتظام کرلیتیں۔ لیکن ان کی وفات کے بعد آمدنی کا یہ ذریعہ منقطع ہو گیا۔ میرزا کے ایک خط سے، جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں فردوس مکان کے نام لکھا ہے[۲۵]، ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کی پنشن کے بارے میں فکر مند تھے۔ لیکن کچھ نہیں کھلتا کہ اس بارے میں انھوں نے کیا اقدام کیا اور اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا!

ہمیں معلوم نہیں کہ میرزا یوسف کی وفات کے بعد لاڈو بیگم نے کیا کیا۔ غالباً وہ اس زمانے میں بیشتر جے پور ہی میں رہیں۔ میرزا غالب ایک خط (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) میں افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی کچھ مدد نہیں کر سکا۔ لکھتے ہیں[۲۶]:

> حقیقی میرا ایک بھائی، دیوانہ مرگیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔

قومی دفتر خانۂ ہند (National Archives of India) نئی دہلی میں دو مسلیں[۲۷] موجود ہیں، جن میں

۲۵- مکاتیبِ غالب، متن: ۱۸ ۲۶- اردوی معلی: ۲۵۵ (بنام یوسف میرزا)

۲۷. Foreign Finance B—Dec. 1862—Nos. 44 45.

Foreign Finance B—June, 1863—No. 37

لاڈو بیگم کی ایک درخواست ملتی ہے (اور یہیں سے ان کا نام بھی معلوم ہوا) جس میں انھوں نے حکومت سے مدد کی التجا کی ہے۔ انھوں نے یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء کو درخواست دی کہ میرے شوہر کی وفات کے دن سے مجھے گزارا دلوایا جائے۔ اس پر ڈپٹی کمشنر ف۔ کوپر (F. Cooper) نے ان کے پورے کوائف ایک گوشوارے کی شکل میں مرتب کر کے ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو کمشنر کے پاس بھیج دیے۔ یہ گوشوارہ بہت اہم ہے اور اس سے بعض نئی معلومات ہتیا ہوتی ہیں؛ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ یہاں درج کر دیا جائے:

۱۔ نمبر: ۱

۲۔ ضلع: دہلی

۳۔ مجوّزہ پنشن کا کھاتہ، نمبر سمیت: خیراتی، حکومتِ صوبۂ شمال و غرب نمبر ۲۰۹ مورخہ ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء

۴۔ درخواست کنندہ کا نام، قوم، عمر، سکونت، درجہ، مرحوم سے رشتہ وغیرہ: لاڈو بیگم، سیّد[۲۸]؛ ۶۰ برس[۲۹]؛ میرزا یوسف کی بیوہ، جسے فیروزپور (نواب شمس الدین کی ضبط شدہ جاگیر) سے پنشن ملتی تھی۔

۵۔ مجوّزہ پنشن کی رقم: ۴۰ روپے مہینا،

۶۔ کس تاریخ سے: ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء

۷۔ کس خزانے سے: دہلی

۲۸۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ بگا بیگم نے فرمایا تھا کہ میرزا یوسف کی شادی مغلوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس دستاویز سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ سیّد تھے۔ چونکہ یہ کوائف خود لاڈو بیگم سے یا ان کے رشتہ داروں سے پوچھ کر لکھے گئے ہوں گے، اس لیے یہ زیادہ معتبر ہیں۔ بگا بیگم کو یاد نہ رہا، یا غلط فہمی ہوئی بہرحال سیّد صحیح اور مغل غلط ہے۔

۲۹۔ یہ درخواست انھوں نے اکتوبر ۱۸۶۲ء میں دی تھی، اور اس وقت ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ ان کی ولادت ۱۸۰۲ء میں ہوئی اور وہ عمر میں میرزا یوسف سے دو ڈھائی برس چھوٹی تھیں۔

۸۔ گذشتہ پنشن یاب کا نام،
تاریخ وفات وغیرہ : میرزا یوسف خان، ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء[30] کو وفات ہوئی،
پنشن ۶۲ روپے ۸ آنہ ماہانہ
۹۔ درخواست کنندہ کے حالات :
جاداد سکنی، سامان، پیشہ، تعلقات : کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں؛ قرض پر گزارا ہے؛ کبھی کبھی اس کے مرحوم خاوند کا بھائی میرزا نوشہ اس کی مدد کرتا ہے، جسے مرحوم کی طرح انہی شرائط کے مطابق اتنی ہی رقم پنشن ملتی ہے۔
۱۰۔ تجویز کے اسباب اور ڈپٹی کمشنر کی رائے :
اگرچہ حکومتِ صوبۂ شمال و غرب کے حکم پر فیروز پور کی یہ پنشن اور اس طرح کی دوسری پنشیں مشروط طور پر منظور کی گئی تھیں، لیکن پنشن یاب کی وفات پر اس کی پنشن کے جاری رکھنے یا اسے ضبط کر لینے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ غدر کے زمانے میں درخواست کنندہ، دہلی میں اپنے شوہر کے ساتھ رہی، جو دیوانہ تھا۔ ان کے خلاف کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوئی، جس سے ثابت ہو کہ ان کا بغاوت سے کسی قسم کا تعلق تھا۔ خاوند کی وفات کے بعد وہ دہلی سے باہر چلی گئی اور الور[31] اور جے پور میں رہی، اور ابھی چند ماہ پہلے واپس دہلی آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک گزارے کی درخواست نہیں دی۔ تمام بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سفید پوش اور شریف آدمی ہے اور اسی حیثیت سے اپنی بیٹی اور نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ان حالات اور خاندان کی انتہائی تنگ دستی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، میں سفارش کرتا ہوں کہ لاڈو بیگم کو ۳۰ روپیہ ماہانہ پنشن ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء سے اس کے مرحوم خاوند کی حینِ حیات پنشن میں سے دی جائے۔ اس کی وفات پر اس پنشن کے اس کی اولاد کے لیے جاری رکھنے کے سوال پر پھر غور کیا جائیگا۔

۳۰۔ یہ ہے کہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ان کی تجہیز و تکفین ہوئی تھی؛ ان کا انتقال شبِ ۱۸/۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ (کلیاتِ نثرِ فارسی (غالب): ۳۹۸) اس سے تصدیق ہو گئی کہ غالب نے دستنبو میں میرزا یوسف کی جو تاریخِ وفات لکھی ہے، وہ درست ہے۔
۳۱۔ یہ پہلی مرتبہ اس تحریر سے معلوم ہوا کہ میرزا یوسف کی وفات کے بعد ان کی بیوہ الور میں بھی رہی تھیں۔

بجٹ میں خیراتی پنشنوں کی رقم میں دس ہزار دو پیہ زاید موجود ہے؛ یہ خرچ اسی رقم سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ کمشنر کی رائے: میرے خیال میں یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء[۳۲] سے ۲۰ روپے ماہانہ ادا کرنا کافی ہوگا۔ درخواست کنندہ اپنے خاوند کی تاریخِ وفات سے بقایا پانے کی حقدار ثابت نہیں ہوتی۔

(دستخط) پ۔ میلول (P. Melvill)
کمشنر

۱۲۔ فنانشل کمشنر کی رائے: میں کمشنر کی رائے سے بالکل متفق ہوں۔ میرے خیال میں کچھ مناسب انتظام ہونا چاہیے، جس سے ایک ایسی عورت کو بدحالی سے بچایا جا سکے، جس کا خاندان کسی زمانے میں اشراف میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ آج تک غیر حاضر رہی ہے، اس لیے میرے نزدیک بقایا ادا کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں۔ میرے خیال میں ۲۰ روپیہ ماہانہ کافی ہوگا۔

(دستخط) د۔ف۔ میکلوڈ (D. F. Mc Leod)
فنانشل کمشنر

لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی کمشنر اور فنانشل کمشنر کی رائے پر صاد کیا اور آخر حکومت پنجاب کی طرف سے یہ کوائف اور سفارش ۱۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو مرکزی حکومت، کلکتہ کے پاس بھیج دی گئی۔ گورنر جنرل نے یکم دسمبر کو حکم دیا کہ اسے وزیر ہند کی منظوری کے لیے ولایت روانہ کیا جائے۔ وزیر ہند نے ۲۰ اپریل ۱۸۶۳ء کو منظوری کا حکم صادر کیا۔ یہ حکم کلکتہ سے ہوتا ہوا جون ۱۸۶۳ء میں پنجاب پہنچا جس پر لاڈو بیگم کو جولائی ۱۸۶۳ء میں یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپیہ مہینا کے حساب سے سارا روپیہ مل گیا۔ ان کی وفات کی تاریخ نہیں معلوم ہو سکی۔

میرزا یوسف کی اولاد میں صرف ایک لڑکی عزیز النسا بیگم تھی۔ اس کا نکاح نواب الٰہی بخش خان معروف کے پوتے (یعنی میرزا علی بخش خان کے بیٹے) غلام فخرالدین سے ہوا تھا۔ عزیز النسا

۳۲۔ یعنی لاڈو بیگم کی درخواست کی تاریخ ہے۔

کے چار بچے تھے۔ ان کی ایک بیٹی سکندر زمانی بیگم (عرف مکھولے بیگم) کا نکاح غالب کے بھانجے جواد علی بیگ عرف مرزا مغل کے صاحبزادے آغا میرزا بیگ سے ہوا۔ یہ وہی آغا میرزا بیگ ہیں، جو حیدر آباد دکن میں غفران مکان نواب محبوب علی خان نظام آصف جاہِ ششم کی کم سنی میں ان کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ انھیں سرکارِ دکن سے "سردر الملک، سردر الدولہ، سردر جنگ" خطابات عطا ہوئے۔ انھوں نے وہاں بہت نام پیدا کیا۔ ان کا خاندان آج تک حیدر آباد میں مقیم ہے۔ انھوں نے اپنے حالات میں ایک کتاب "کارنامۂ سروری" لکھی تھی، جسے اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ سابق جج عدالت عالیہ حیدر آباد نے شائع کیا تھا۔

نواب سرور الملک ہی کے ایما پر غلام فخرالدین بھی دکن پہنچے؛ ریاست سے ان کا بھی دو سو ماہانہ منصب مقرر ہو گیا تھا۔ ان کے صاحبزادے محمد سعید خان تھے، جو ریاست میں ملازم ہو گئے۔ لیکن بعد کو حضرت محمد عمر شاہ کے زیرِ اثر انھوں نے دنیا ترک کر دی اور پھر ۲۲ برس کپڑے نہیں پہنے۔ وہ محلہ مستعد پورہ میں مدفون ہیں۔ میرزا نصر اللہ خان سابق صدرِ محاسب بزمانۂ نظامِ سابع، عثمان علی خان مرحوم انہی کے بیٹے تھے[۳۳]۔ ان کا انتقال ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ہوا اور وہ بھی اپنے والد کے جوار میں محلہ مستعد پورہ میں دفن ہوئے۔

۳۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دیباچۂ دیوان معروف۔

ملّا عبدالصمّد

(استادِ غالب)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے ان کے استاد ملّا عبدالصمد کی ہستی کے بارے میں شک و شبہہ کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ ان میں سے صرف ایک شخص (حکیم غلام رضا خان) کی مخالفانہ رائے ہم تک پہنچی ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ بعد کو اگر سب نہیں، تو ان میں سے بیشتر حضرات غالباً مطمئن ہو گئے ہونگے۔

جناب قاضی عبدالودود نے ایک مضمون[1] میں دوبارہ یہ مسئلہ اٹھایا ہے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "عبدالصمد غالب کے بحرِ تخیّل کی ایک موج سے زیادہ نہیں"، اور خارج میں اس کا وجود نہیں تھا۔ اس نظریے کی تائید میں انھوں نے جو دلائل دیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) قاطع برہان سے پہلے غالب نے اپنی کسی کتاب میں عبدالصمد کا ذکر نہیں کیا۔ اور اس میں بھی یہ ذکر اس لیے کیا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ "تحقیقِ فارسی کے معاملے میں کوئی دوسرا ہندوستانی اس کا شریک" نہیں۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" غالب نے ایک ایسا فرضی استاد گڑھ لیا، جو علومِ عربیہ و فارسیہ میں یکساں تبحر رکھتا تھا اور اس تلمذ کو دوسرے فارسی دانانِ ہند پر اپنے تفوق کی وجہ بتایا۔" (ص ۲۵۲)

(۲) "غالب کے سوا دنیا کا کوئی دوسرا شخص عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں، نہ اس کی کوئی تحریر موجود ہے، نہ کسی نے اس کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔" (ص ۲۵۳)

(۳) "عبدالصمد اگر وجودِ خارجی رکھتا، اور غالب اس کے شاگرد ہوتے"، تو چونکہ "عبدالصمد کا ذوقِ شعری وہی ہونا چاہیے، جو اس کے ایرانی ہم عصروں کا تھا، لیکن غالب کی ابتدائی شاعری جو عبدالصمد سے متاثر ہونی چاہیے، سراسر متروک طرز میں ہے۔" (ص ۲۵۴)

۱۔ "ہرمزد ثم عبدالصمد" از قاضی عبدالودود مشمولہ احوال غالب: ۲۳۴ - ۲۶۵

(۴) "غالب کے یہاں اپنے عہد کے مخصوص محاورے اور روزمرّے اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدا ہی میں کسی ایرانی کی صحبت میسّر ہوئی ہوتی، تو صورتِ حال اس سے مختلف ہوتی"۔ (ص ۲۵۴)

(۵) دساتیر سے قدیمی واقفیت کے ادّعا کے باوجود، غالب کی "ابتدائی نظم و نثر میں نہ دساتیر کے خاص الفاظ ملتے ہیں، اور نہ اس میں اس کا ذکر آیا ہے"۔ (ص ۲۵۴)

(۶) ۱۲۵۶ھ کے ایک خط بنام سراج الدین احمد میں انھوں نے (۱) دساتیر کا ذکر نہیں کیا؛ (۲) عبدالصمد سے اپنے استفادے کا ذکر نہیں کیا۔ (ص ۲۵۵)

(۷) کلکتے میں جب ان پر قتیل کے حوالے سے اعتراض ہوا ہے، تو انھوں نے "اس سلسلے میں ان ایرانی شعرا کے نام بھی لیے ہیں، جن کے تتبع پر انھیں ناز ہے۔ مقتضائے مقام تھا کہ عبدالصمد سے فیضیابی کا بھی ذکر کیا جاتا، لیکن کنایۃً بھی اس کی طرف اشارہ نہیں۔ خاتمۂ کلیاتِ نظمِ فارسی میں بھی عبدالصمد کا ذکر بے محل نہ ہوتا، لیکن وہ بھی اس سے خالی ہے"۔ (۲۵۵)

(۸) "موقع آیا ہے، تو انھوں نے صراحۃً لکھا ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں۔۔۔۔ قاضی محمد صادق خان اختر کے تذکرے کے لیے، اپنا ترجمہ سپردِ قلم کیا، اس میں یہ عبارت بھی ہے: درسخن از پرورش یافتگانِ مبدءِ فیاضم و سوادِ معنی را بہ فروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام، از ہیچ آموزگاری حقِ آموزگاریم بگردنم و بارِ رہنمایم بر دوش نیست"۔ (ص ۲۵۵ - ۲۵۶)

(۹) "غالب نے قاطع کی تصنیف سے پہلے ظاہرا کسی سے زبانی بھی عبدالصمد کے ہندوستان آنے اور اس سے مستفید ہونے کا ذکر نہیں (کیا)، ورنہ یہ بات ان اصحاب کو جنھوں نے ان کا حال اس سے پہلے لکھا ہے، ضرور معلوم ہوتی۔ ذکا، سرور، شیفتہ، کریم الدین، صابر، باطن، محسن، سیّد احمد خان کی کتابوں میں عبدالصمد اور اس تلمذ کا کنایۃً بھی مذکور نہیں"۔ (ص ۲۵۶)

جناب قاضی صاحب نے بعض اور ضمنی دلائل بھی پیش کیے ہیں، جن کی طرف حسبِ موقع اپنی جگہ پر اشارہ کیا جائیگا، لیکن یہ تو دلیلیں بنیادی کہی جا سکتی ہیں، اور انھیں کو انھوں نے الگ فصل میں اس غرض سے بیان کیا ہے کہ "کیا عبدالصمد وجودِ خارجی رکھتا تھا یا نہیں"۔ میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایک دلیل بھی قطعی طور پر ان کے اس دعوے کی مؤیّد نہیں ہو سکتی۔ ہم ان پر الگ الگ غور کرتے ہیں:

(۱) جناب قاضی صاحب محترم لکھتے ہیں کہ غالب نے "قاطع برہان" میں ملّا عبدالصمد کا نام اس لیے لکھا تھا کہ اس طرح اپنے ہمعصروں پر اپنی فارسی میں یکتائی ثابت کریں، نیز مخالفوں کا منہ بند کرسکیں۔ یہ اعتراض کرتے وقت یہ خود بخود فرض کرلیا گیا ہے کہ میرزا یہ پہلے سے جانتے تھے کہ لوگ "قاطع برہان" کی مخالفت کرینگے، حال آں کہ اس مفروضہ کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جناب موصوف فرماتے ہیں کہ غالب کو معلوم تھا کہ "قاطع برہان" کی اشاعت پر ان کی مخالفت ہوگی؛[۲] اور اس کے ثبوت میں انھوں نے میرزا کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔ میرزا کتاب کی اشاعت سے پہلے میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں[۳]:

> یاد رہے کہ جو صاحب اس (کتاب) کو دیکھینگے، وہ ہرگز نہ سمجھینگے۔ صرف "برہانِ قاطع" کے نام پر جان دینگے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہونگی، وہ اوس کو مانیگا (یہاں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ مالک رام)۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہونگی، اور نہ کوئی میری محنت کی داد دیگا۔

یہاں میرزا نے مخالفت کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ اس تمنّا کا اظہار کر رہے ہیں کہ لوگ کتاب کے محتویات کو "سمجھیں" اور ان کی "محنت کی داد" دیں۔ عین ممکن ہے کہ کتاب کی مخالفت کا امکان بھی میرزا کے ذہن میں رہا ہو، لیکن بنیادی طور پر وہ داد کے خواہاں تھے۔ اور یقیناً ان کے ذہن میں یہ تو کبھی نہیں ہوگا کہ لوگ اتنی شدّت سے مخالفت کرینگے، اور اتنی کتابیں ان کے جواب میں لکھی جائینگی اور بات سب و شتم تک جا پہنچیگی۔

اس کے علاوہ اگر قاضی صاحب موصوف کا نظریہ تسلیم کیا جائے، تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ غالب نے سوچ سمجھ کر ایک لمبی اسکیم تیار کی تھی یعنی پہلے "برہانِ قاطع" پر اعتراض لکھے، پھر انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا؛ پھر چونکہ وہ جانتے تھے کہ دنیا اس کی مخالفت کریگی، اس لیے انھوں نے اپنے دماغ سے ایک شخص ملّا عبدالصمد پیدا کیا اور تمام نئی باتیں اس کے نام سے لکھ دیں، تاکہ لوگ اس طرح مرعوب ہوکر ان کی بجائے، ملّا عبدالصمد کی طرف متوجّہ ہو جائیں۔ کیا غالب کی شخصیّت اور زندگی سے متعلق جو کچھ ہمیں معلوم ہے، اس میں کوئی ایسی بات ہے، جس سے پایا جائے کہ وہ پہلے سے اتنی لمبی اسکیم یا منصوبہ سوچنے اور اسے معرضِ عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے؟ ایک شخص نے ۶۵ برس تک

۲- احوالِ غالب: ۲۶۰

۳- اردوی معلیٰ: ۳۹۶؛ خطوطِ غالب: ۳۰۶

آپ کے درمیان معمول کے مطابق شریفانہ زندگی بسر کی ہے، آپ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ جب وہ موت کے کنارے پہنچ گیا ہے، یوں یکایک بدل جائیگا! کسی مضمون یا تحریر کو کسی دوسرے کے نام سے چھاپ دینا بالکل الگ بات ہے۔ یہ ان کے پیشے سے متعلق ہے۔ وہ کسی خاص شخص کو اس درجے کا نہیں خیال کرتے کہ اس کے منہ آئیں، اور خود اس سے خطاب کریں۔ اس لیے چند صفحے لکھ کر، اپنے کسی شاگرد یا دوست کے نام سے چھاپ دیتے ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ انھوں نے کسی خاص اسکیم کے تحت ایک افترا کیا، بہت بڑی جسارت اور دعویٰ ہے؛ اور اسے درست ثابت کرنے کے لیے اس سے بہت زیادہ محکم دلائل کی ضرورت ہے۔

لیکن جن حالات میں "قاطع برہان" وجود میں آئی تھی، وہ بجائے خود قاضی صاحب کے پورے مفروضے کے خلاف ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ "غدر" کے ایام میں جب غالب کی نقل و حرکت بہت محدود ہو گئی، اور ان کا بیشتر وقت گھر پر گزرنے لگا، تو انھوں نے "برہانِ قاطع" کا نسخہ دیکھنا شروع کیا، جو پہلے سے ان کے پاس موجود تھا۔ وہ "دعویٰ انا ولا غیری" تو ایک زمانے سے کر رہے تھے، اور یہ بھی ضرور چاہتے ہونگے کہ لوگ ان کے دعویٔ یکتائی کو تسلیم کریں۔ اس کے باوجود انھوں نے کبھی "عَلَمِ یکتائی بلند" کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ کیوں؟ سچی بات یہ ہے کہ یہ محض اتفاق تھا کہ "غدر" ہو گیا اور انھیں "برہانِ قاطع" کو زیادہ توجہ سے دیکھنے کا موقع مل گیا، جس پر "قاطع برہان" کی تالیف کا ڈول بن گیا، ورنہ پہلے سے نہ ان کے ذہن میں کوئی اسکیم تھی، نہ انھوں نے پیش بندی کے طور پر عبدالصّمد کی ہستی بطور حجت پیش کی۔ یہ کتاب ثمرہ تھی "غدر" کے غیر معمولی حالات کا اور "برہانِ قاطع" کے نسخے کا ان کے پاس موجود ہونے کا۔

(۲) رہا یہ کہ غالب کے سوا "دنیا"[۴] کا کوئی اور شخص ملّا عبدالصّمد کو نہیں جانتا، تو اس میں غالب کا قصور ہے، نہ بیچارے عبدالصّمد کا۔ وہ کوئی فاتح نہیں تھے، ولی اور نبی نہیں تھے کہ تاریخوں میں ان کا نام آتا۔ ایک سیلانی آدمی چلتا پھرتا آیا، سیر سپاٹا کر کے واپس چلا گیا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس کے حالات اور نسب نامے کی کھوج لگاتا! خدا معلوم کتنے سیّاح ہندستان آئے، جنھوں نے یہاں سے واپس جا کے اپنے سفرنامے لکھے، لیکن ہندستان کے کسی مصنّف یا تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا؛ ان کا ہندستان آنا اور یہاں کے مختلف شہروں میں گھومنا پھرنا، ہمیں ان کے سفرناموں سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ سفرنامے نہ ہوتے، تو کیا ہم ان سیّاحوں کے وجود سے انکار کر دینے میں حق بجانب ہوتے؟

۴۔ کیا یہاں "دنیا" سے مراد چار دانگ عالم ہے؟

رہا یہ کہ "نہ اس کی کوئی تحریر موجود ہے، نہ کسی نے اس کی (کسی) کتاب کا ذکر کیا ہے"، تو ہو سکتا ہے کہ اس نے کچھ لکھا ہی نہ ہو؛ اور یہ بھی حدِ امکان میں ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا، ضائع ہو گیا۔ کیا جو کچھ مصنّفینِ عالم نے لکھا تھا، وہ سب کا سب محفوظ رہا؛ اور شائع ہو گیا ہے؟

(۳، ۴) موصوف فرماتے ہیں کہ "عبدالصّمد کا ذوقِ شعری وہی ہونا چاہیے، جو اس کے ایرانی ہمعصروں کا تھا۔ لیکن غالب کی ابتدائی شاعری جو" (عبدالصّمد کا شاگرد ہونے کے باعث) "عبدالصّمد سے متاثر ہونی چاہیے" سراسر متروک طرز میں ہے"۔ نیز "غالب کے یہاں اپنے عہد کے مخصوص محاورے اور روزمرّے اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدا ہی میں کسی ایرانی کی صحبت میسر آئی ہوتی، تو صورتِ حال اس سے مختلف ہوتی"۔

سوال یہ ہے کہ غالب نے عبدالصّمد سے کیا حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟ خود جناب قاضی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کا اعادہ کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اسی میں ان کے زیرِ نظر اعتراض (یا دلیل) کا جواب بھی ہے۔ غالب لکھتے ہیں[۵]:

من آیینِ سخن آفرینی و بیگانہ بینی از وی فراگرفتہ ام .....

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم

سیرابیِ نُطقم اثرِ فیضِ حکیم است

مولوی ضیاء الدین خان دہلوی کو لکھتے ہیں[۶]:

فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص وارد ہوا کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے، مع ہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر، اور مومن، موحّد، صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور لطائفِ فارسی بحت اور غوامضِ فارسی آمیختہ بعربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوّج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوندِ ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپِ عہد و بزرجمہرِ عصر تھا، حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی۔

۵۔ قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ: ۱۵

۶۔ غالب کے خط کا عکس مشمولۂ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) مقابل ص ۴۸

۷۔ غالب نے لغزشِ قلم سے بزرجمہر (بہ جیمِ فارسی) لکھا ہے۔

نواب کلب علی خان والیِ رامپور کو لکھتے ہیں :

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تینوں جگہ انھوں نے عبدالصمد سے زبان سیکھنے کی بات کی ہے۔ پہلے اقتباس میں "معنی آفرینی" کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اسی مضمون میں کسی دوسری جگہ بتایا ہے، اس سے ان کی "فارسی زباندانی" اور "نکتہ آفرینی" مراد ہے۔ ضیاء دہلوی کے خط میں "لطائف فارسی بحت اور غوامضِ فارسی آمیختہ بعربی" سیکھنے کا ذکر ہے۔ نواب کلب علی خان کے خط میں "حقائق و دقائقِ زبانِ پارسی" کی تحصیل کا لکھا ہے۔ کہیں انھوں نے عبدالصمد سے شعر کے فن و رموز یا عروض پڑھنے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ نہ انھوں نے لکھا ہے کہ عبدالصمد شعر بھی کہتا تھا، جس سے ہمیں اس کے "ذوقِ شعری" کا معیار جانچنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ جب صورتِ حال یہ ہے، تو یہ کہنا کہ استاد کے "ذوقِ شعری" سے شاگرد کی "ابتدائی شاعری" متاثر ہونا چاہیے تھی، کس حد تک جائز ہے؟

اور "غالب کی ابتدائی شاعری" کا زمانہ کیا قرار دیا جائیگا؟ انھوں نے فارسی میں شعر گوئی سفرِ کلکتہ کے زمانے کے قریب شروع کی تھی یعنی ۱۸۲۷ - ۱۸۲۸ء میں، جب کہ عبدالصمد یہاں سے ۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ء (یعنی اس سے پندرہ سولہ برس قبل) روانہ بھی ہو چکے تھے۔ اگر استاد کی تعلیم کا اثر پندرہ سولہ برس بعد تک رہ سکتا تھا، تو بقیہ عمر کی شاعری بھی کیوں اس سے مستثنیٰ قرار دی جائے؟

جناب قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں[9] کہ "غالب اور ان کے کسی ایرانی معاصر مثلاً یغما کی نظم و نثر کا مقابلہ کیا جائے، تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ غالب کے یہاں اپنے عہد کے مخصوص ایرانی محاورے اور روزمرّے اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدا میں کسی ایرانی کی صحبت میسّر ہوئی ہوتی، تو صورتِ حال مختلف ہوتی"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبدالصمد ایران سے اپنے معاصرین کی مصنّفاتِ نظم و نثر کا پشتارہ ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے، تاکہ ہندستان میں اگر کوئی طالب علم ان سے جدید فارسی پڑھنا چاہے، تو استاد اور شاگرد کو کتبِ نصاب کی تلاش کی زحمت نہ ہو۔ نیز غالب نے عبدالصمد

۸- مکاتیب غالب (متن) : ۶۰

۹- احوال غالب : ۲۵۴

کے سامنے فارسی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی، جس پر انھوں نے عبدالصمد سے اصلاح بھی لی۔ کیا یہ دونوں باتیں ماننے کی ہیں؟

غالب نے جو کتابیں بھی عبدالصّمد سے پڑھی ہوں، بہت کم امکان ہے کہ وہ ان کتابوں سے مختلف ہوں جو ان کے زمانے میں ہندستان میں دستیاب ہوتی تھیں، اور جو عہدِ مغلیہ سے یہاں کے مدارس میں رائج اور زیرِ درس و مطالعہ تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ استاد محض کسی کتاب کا متن پڑھا دینے پر اکتفا نہیں کرتا؛ وہ تشریح و توضیح میں جو کچھ طالب علم کے ذہن نشین کرتا ہے، دیکھا جائے تو تعلیم کا بنیادی اور اہم حصہ وہی ہوتا ہے ——— اس سے شاگرد کی نظر وسیع ہوتی ہے؛ اسے زبان کے ان رموز و دقائق سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، جو کسی قواعد کی کتاب میں منضبط نہیں ملتے؛ اس کے دل میں مزید مطالعے کا شوق پیدا ہوتا ہے، جس سے نہ صرف بتدریج اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ نکتہ آفرینی کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔

غالب نے بھی عبدالصّمد سے یہی حاصل کیا تھا، جسے وہ "لطائفِ فارسی بحت اور غوامضِ فارسی آمیختہ بعربی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ عبدالصّمد ان کے مکان پر دو سال ٹھہرا تھا۔ تعلیم کے لیے یہ مدت زیادہ نہیں، لیکن کچھ ایسی کم بھی نہیں؛ ذہین اور مستعد اور اخّاذ طالب علم اس قلیل عرصے میں بھی بہت ترقی کر سکتا ہے۔ غالب نے بھی استاد کی صحبت سے پورا استفادہ کیا۔ ظاہرا مولوی محمد معظّم کے مکتب سے وہ ۱۲-۱۳ برس کی عمر میں فارغ ہو گئے تھے۔ فارسی کا شوق وہیں پیدا ہوا تھا، جس کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں فارسی میں ایک غزل کہی جس کی ردیف پر استاد نے اعتراض کیا تھا۔ ظہوری کا کلام آسان نہیں؛ اور غالب نے یہ اسی ابتدائی زمانے میں دیکھ لیا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد عبدالصّمد کے تلمّذ نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اس سے بھی وہ سولہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ذاتی مطالعہ تو جاری رہا، لیکن پھر کسی استاد سے کچھ پڑھنے یا پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

غرض انھوں نے عبدالصّمد سے وہی متون پڑھے ہوں گے، جو آسانی سے آگرے میں مہیّا ہو سکتے تھے۔ انھیں اپنے ہمعصروں کی بہ نسبت یہ مزید آسانی میسّر آ گئی کہ ان کا استاد ایک اہلِ زبان فاضل تھا، جس سے انھیں فارسی زبان میں وہ بصیرت حاصل ہو گئی، جو غالباً کسی ہندستانی استاد کی صحبت میں ممکن نہ ہوتی۔

اس اعتراض پر مزید غور کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مفید ہوگا کہ غالب کے زمانے میں ان کے کون کونسے معاصر ایرانی شعرا کا کلام چھپ چکا تھا؛ اور کیا ان کے دیوان ہندستان پہنچ بھی گئے تھے!

(۵، ۶) ان دونوں شقوں کا مفاد یہ ہے کہ اگرچہ غالب نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کی دساتیر سے واقفیت بہت قدیم ہے، ان کی ابتدائی نثر میں دساتیر کے خاص الفاظ نہیں ملتے، نہ انھوں نے کسی ابتدائی نثر میں دساتیر کا ذکر کیا ہے۔ ۱۲۵۶ھ میں سراج الدین احمد نے غالباً اپنے کسی دوست مولوی سیّد آل حسن کی فرمایش پر انھیں لکھا کہ وہ

نخستے از رسم وراہِ سترگانِ پارس برگوید وکتابے ازاں گروہ نشان دہد کہ رازِ آں دیرین کیش وسازِ ایں باستانی زبان ازاں اوراق تواں یافت۔[10]

جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ موقع (دساتیر) سے اپنی واقفیت کے اظہار کا تھا لیکن اپنے جواب میں وہ صرف 'دبستانِ مذاہب' کا نام لیتے ہیں، گو خود اس سے مطمئن نہیں"[11] "نیز جواب میں غالب وہ باتیں لکھ سکتے تھے جو ان کے قول کے بموجب انھیں عبد الصمد سے معلوم ہوئی تھیں اور جو قاطع میں مندرج ہیں، لیکن وہ ان کی طرف اشارہ نہیں کرتے اور قدیم ایرانیوں کے حالات کی تلاش کو بیسود قرار دیتے ہیں۔"[12]

قاضی صاحب صحیح فرماتے ہیں اور میں بھی ان سے اتفاق کرتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ موقع بموقع، اور محل بمحل، اور مقتضائے مقام کے معیار، مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی ضرور نہیں کہ جس بات کو میں بامحل خیال کرتا ہوں، آپ کی نظر میں بھی وہ بامحل ہو؛ یا آپ جسے مقتضائے مقام سمجھتے ہیں، میں بھی اسے اسی طرح سمجھوں۔ ہر ایک اپنے خیال اور فعل میں مختار ہے۔ غالب ہم دونوں سے متفق نہیں تھے، انھوں نے یہ ضروری خیال نہیں کیا کہ یہاں دساتیر اور عبد الصمد کا ذکر کریں، تو ظاہر ہے کہ وہ اس پر مجبور نہیں تھے۔ اور اگر انھوں نے کسی مصلحت سے اپنے علم کا مظاہرہ نہیں کیا، تو ہم کون ہیں، اس پر شکایت یا اعتراض کرنے والے!

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص موقعے پر اپنے کسی علم کا اظہار نہیں کرتا، تو کیا اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا؛ اور اگر تھا، تو وہ لازماً غلط تھا؟

۱۰۔ کلیات نثر غالب (فارسی): ۱۵۲

۱۱۔ احوال غالب: ۲۵۵

۱۲۔ ایضاً

(۷) کلکتے کے مشاعرے میں غالب کے دو شعروں پر اعتراض ہوئے تھے۔ پہلا تھا:

جزو دے از عالم، واز ہمہ عالم بیشم	ہمچو موئے، کہ بتاں را زمیاں برخیزد

اس شعر پر اعتراض یہ تھا کہ مصرعِ اولیٰ میں بیش کی جگہ، تفضیلِ بعض بیشتر ہونا چاہیے تھا۔ نیز یہ کہ براجتہادِ قتیل ہمہ عالم کی ترکیب غلط ہے، کیونکہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ جو کثرت پر دلالت کرتا ہے، صحیح نہیں ہے۔

دوسرا شعر تھا:

شورِ اشکے، بہ فشارِ بنِ مژگاں، دارم	طعنہ، بر بے سروسامانیِ طوفاں، زدہ۔

اس پر کہا گیا تھا، کہ مصرعِ ثانی میں زدہ کا استعمال غلط طریقے پر ہوا ہے۔

شعروشاعری کی دنیا میں ایسے اعتراض کوئی انوکھی چیز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب کسی شخص پر اعتراض ہوا کرتا ہے، تو وہ ایسے موقع پر کیا کرتا ہے؟ یا اس کے حامی کیا کرتے ہیں؟ بلا استثناء وہ سند میں ایسے شعرا، وادبا، کا کلام پیش کرتے ہیں، جو معترض کا بھی مستند علیہ ہو اور اس طرح یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جب معترض کا اپنا مسلّمہ استاد، محلِ اعتراض لفظ یا ترکیب کا استعمال کر چکا اور اس طرح اس کے صحیح ہونے کی شہادت دے چکا ہے، تو اب وہ اس کے استعمال پر کیسے انگلی رکھ سکتا ہے! اس موقع پر یہی ہوا تھا۔

غالب نے اور ان کے دوستوں نے ہمہ کا مفرد لفظوں کے ساتھ ربط درست ثابت کرنے کے لیے حافظ اور سعدی کے کلام سے سندیں پیش کیں یا زدہ کے استعمال سے متعلق خود غالب نے مثنوی بادِ مخالف میں بیدل کے کلام سے سند دی تھی۔ یقیناً اعتراض اٹھانے کا صحیح طریقہ یہی تھا کہ فریقین کے جو مسلّمہ استاد تھے، ان کے کلام سے استناد کیا جاتا۔ بھلا اس جگہ اپنے استادوں کے نام گنوانے کا کیا موقع تھا! اعتراض یہ تھا کہ تم نے یہ لفظ غلط لکھا ہے۔ ضرورت اسے درست ثابت کرنے کی تھی، نہ یہ کہنے کی کہ میرا استاد مُلّا عبدالصّمد تھا، جسے ان کے مخالف جانتے تک نہیں تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے، تو اس پر ”سوال از آسمان وجواب از ریسمان“ کی مثل صادق آتی۔

رہا، ان کا مثنوی بادِ مخالف (آشتی نامہ) میں بعض اساتذۂ فارسی، حزیں، اسیر، صائب، عرفی وغیرہ کے نام لینا، تو یہ قتیل کی کم حیثیتی ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ان اہلِ زبان اساتذۂ سخن کے مقابلے میں قتیل کی کیا ہستی ہے کہ میں انھیں چھوڑ کے اُس کی پیروی کرنے لگوں۔ اس مقام کے اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نام گنانے سے ان کا مدعا کیا تھا۔

لکھتے ہیں[۱۲]:-

دیدنکہ، در پیشگاہِ بزمِ سخن ... بہ زبانہا، فتادہ است زمن
کہ فلاں با قتیل نیکو نیست ... مگسِ خوانِ نعمتِ اُو نیست
فیضے از صحبتِ قتیلم نیست ... رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
نہ ہوا خواہیے، نہ دشمنیے ... درمیان است، پایے ہم فنیے
حاشَ للہ، کہ بد نمی گویم ... وایں ہم، از پیشِ خود، نمی گویم
مگر آناں، کہ پارسی دانند ... ہم بریں قول و عہد و پیمان اند
کہ ز اہلِ زباں، نبود قتیل ... ہرگز از اصفہاں، نبود قتیل
لاجرم، اعتماد را نسزد ... قول وے، استناد را نسزد
کایں زبان، خاصِ اہلِ ایران است ... مشکلِ ما و سہلِ ایران است
سخنست آشکار و پنہاں نیست ... دہلی و لکھنؤ، ز ایراں نیست
دوستاں را، اگر زمن گلہ است ... کہ خرامت، خلافِ قافلہ است
می رویم، از پےِ قتیل، ہمہ ... ساختہ مرورا، دلیل، ہمہ
تو ازیں حلقہ، چوں بدر زدۂ ... گام بر جادۂ دگر، زدۂ
اے تماشائیانِ ژرف نگاہ! ... ہاں، بگوئید حَسبۃً للہ
کہ چساں، از حزیں بہ پیچم سر ... آں بجادو دمے، بدہر سَمَر
دل دہد، کز اسیر برگردم ... زاں نو آییں صفیر برگردم
دامن از کف، کنم چگونہ رہا ... صائب و عرفی و نظیری را
پردہ سنجانِ باستانی را ... طالب و سعدی و فغانی را
خاصہ روح و روانِ معنی را ... آں ظہوری، جہانِ معنی را
فتنۂ گفتگوے اینانم ... مستِ لاے سبوے اینانم

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں وہ اپنے معلّمین کا ذکر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ قتیل کے حوالے سے اعتراض لغو ہے کیونکہ بہرحال اس کا درجہ غیر ملکی زباندان سے زیادہ کا

۱۲- یہ اشعار اُس روایت سے لیے گئے ہیں، جو غالباً اولیں ہے؛ اور جس طرح یہ شعر کلکتے میں پڑھے گئے تھے دیکھیے گل رعنا، مطبوعہ لاہور (۲۶۱ - ۲۶۳)۔ متداول روایت میں اس سے کچھ اختلاف ہے۔

نہیں اور ہم سند کے موقع پر اسے حزین، صائب، عرفی، نظیری، سعدی اور دوسرے اساتذۂ اہل زبان کے مقابلے میں پیش نہیں کر سکتے۔ مجھ پر جو اعتراض کیا گیا ہے، جب اس کے لیے اہلِ زبان کے کلام سے نظیر مل گئی، تو اب وہ قتیل اور اس کے ساتھ کے دوسرے ہندستانی فارسی دانوں کے اجتہاد کے مطابق لاکھ غلط ہوا کرے، اس کی کون پروا کرتا ہے! میں اہلِ زبان کا متبع ہوں، نہ کہ ہندستانی فارسی نویسوں کا۔ من ہمایم، مگس چرا باشم۔ میرے کلام کی صحت کا معیار وہ اصول ہیں، جو اہلِ زبان نے وضع کیے ہیں۔ اگر وہ قتیل اور واقف کے اصولوں پر صحیح نہیں اترتے، تو مجھے اس سے سروکار نہیں:

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را چہ شناسد قتیل و واقف را

غور فرمایئے کہ کیا یہ مقام ملا عبدالصمد کا ذکر کرنے کا مقتضی تھا!

رہا، کلیاتِ نظمِ فارسی کی تقریظ میں ملا عبدالصمد کا ذکر، تو پہلے اس کی عبارت ملاحظہ ہو:

ہرچند منش کریزدانی سرد ش ست، در سر آغاز نیز پسندیدہ گوی و گزیدہ جوی بود، امّا بیشتر از فراخ روی بے جادہ ناشناساں برداشتے و گزشی رفتارِ آناں را لغزشِ مستانہ انگاشتے، تا ہمدرا نگاہ پوشیز اماں رابہ نجستگیِ ارزش ہمقدی کہ در من یافتند، مہر جنبید و دل از آزرم بدر دآمد؛ اندوہ آوارگیہاے من خوردند و آموزگارانہ درمن نگرستند۔

اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری، نظیری نے میری رہنمائی کی۔

واکنوں بہ یُمنِ فرہ پرورشِ آموختگیِ ایں گروہِ فرشتہ شکوہ کلکِ رقاصِ من بخرامش تدرو ست و برامش موسیقار، بجلوہ طاؤس ست و بہ پرواز عنقا۔

مثنوی بادِ مخالف کی طرح یہاں بھی وہ ان اساتذۂ شعر کا ذکر کر رہے ہیں، جن کے تتبّع سے انھوں نے نہ صرف اپنی ابتدا کی بےراہروی سے نجات حاصل کی، بلکہ دنیاے شعر و ادب میں خود اہلِ زبان کی ہمسری کے مقام پر پہنچ گئے۔ مُلّا عبدالصمد اس گروہ میں کیونکر شامل کیے جا سکتے ہیں: اور یہ کونسا محل تھا ان کا ذکر کرنے کا!

(۸) مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر قاضی محمد صادق خان اختر کے تذکرے آفتابِ عالمتاب کے لیے اپنے حالات میں انھوں نے یہ لکھا کہ میں تلمیذ الرحمٰن ہوں، اور کسی کی شاگردی کا بار میری گردن پر نہیں، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ چونکہ انھوں نے یہاں مُلّا عبدالصمد کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا

اس شخص کا خارجی وجود نہیں تھا، کسی عنوان درست نہیں ہوگا۔ اگر یہ طریقۂ استدلال درست اور جائز ہے، تو دیکھا جائے کہ یہاں انھوں نے مولوی محمد معظم کا نام بھی نہیں لیا، حال آں کہ ہمیں دوسرے ذرائع سے یقینی طور پر معلوم ہے کہ انھوں نے مولوی صاحب موصوف کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شعر و شاعری کی دنیا میں، شاگردی سے مراد، ہمیشہ فنِ شاعری کی تعلیم اور کلام پر اصلاح ہوا کرتی ہے، نہ کہ عام مدرسے اور مکتب کی تعلیم۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ شیفتہ، مومن کے شاگرد تھے، یا حالی، غالب کے شاگرد تھے، تو ہم کیا بتانا چاہتے ہیں؟ کیا اس سے ہمارا یہ مدعا ہوتا ہے کہ ان اصحاب نے مومن اور غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی تھی، یا یہ مراد ہوتی ہے کہ انھوں نے عربی اور فارسی، یا درسیاتِ نظم و نثر کے اسباق مومن اور غالب سے پڑھے تھے؟ جب ہم کہتے ہیں کہ غالب نے مولوی محمد معظم اور ملاّ عبدالصمد سے تعلیم حاصل کی، تو ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ان دونوں بزرگوں سے فارسی زبان پڑھی تھی۔ رہی شعر و سخن کی بات، تو یہ دوسرا میدان ہے۔ اس سے ان دونوں استادوں کا کوئی واسطہ تھا، نہ میرزا نے ان سے اصلاح لی تھی؛ اس میں وہ واقعی تلمیذالرحمٰن تھے یہی وجہ ہے کہ "آفتاب عالمتاب" کے لیے اپنے حالات لکھتے وقت انھوں نے نہ مولوی محمد معظم کا ذکر کیا، نہ ملاّ عبدالصمد کا؛ اور صاف لکھ دیا[۱۴]:

> در سخن، از پرورش یافتگانِ مُبداءِ فیاّضم، و سوادِ معنی را بفروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام۔ از ہیچ آفریدہ، حقِ آموزگاریم بگردن، و بارِ منتِ رہنمائیم بردوش، نیست۔

وہ اپنی مفصل سوانح عمری نہیں لکھ رہے تھے۔ بلکہ شعرا کے تذکرے کے لیے مختصر حالات مہیّا کر رہے تھے۔ پرانے تذکرہ نگاروں کا کیا دستور تھا، یہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ صاحبِ ترجمہ نے اپنا کلام کسے دکھایا، اور کس سے اصلاح لی۔ غالب نے لکھ دیا، کہ اس بارے میں (در سخن) کسی کا بارِ احسان میری گردن پر نہیں اور میں نے مبداءِ فیاض کے سوا کسی اور سے استفادہ نہیں کیا۔ اس میں کوئی غلط بیانی یا مبالغہ نہیں؛ یہ امرِ واقع ہے۔

جناب قاضی عبدالودود کی رائے میں غالب نے ملاّ عبدالصمد سے شعر پر اصلاح لینے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ غالب کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں[۱۵]:

۱۴۔ کلیاتِ نثرِ غالب: ۱۵۵ (مطبع نولکشور، کانپور ۱۸۷۵)

۱۵۔ قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ (مرتبہ قاضی عبدالودود): ۵۱

.... عبدالصمد .... درسالِ یک ہزار و دویست و بیست و شش ہجری بطریقِ سیاحت بہ ہند آمد، و بہ اکبرآباد کہ پیکر پذیرفتن و خرد آموختنِ من ہم درآں شہر خجستگی بہر بودہ است، دو سال بکلبۂ احسز انِ من آسودہ است، و من آیینِ معنی آفرینی و کیشِ یگانہ بینی از وَی فراگرفتہ ام - برنہادِ وَی آفرین باد و بر روانِ وَی آباد۔

موصوف فرماتے ہیں کہ یہاں "معنی آفرینی" سے مراد "شعرو سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں کی اصلاح" ہے - لہذا غالب نے "آفتاب عالمتاب" کے لیے اپنے جو حالات لکھے ہیں، ان میں ملا عبدالصمد سے اپنے استفادے کا ذکر نہ کر کے اس کی تردید کر دی ہے اور یوں موخرالذکر کے عدم وجود پر ثبوت فراہم کیا ہے - اپنی تائید میں انھوں نے نامۂ غالب کی مندرجۂ ذیل عبارت[16] کی طرف بھی اشارہ کیا ہے[17]:

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالب، تیرا بھی مولد ہندستان ہے، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے :

ہرچہ از دستگہِ پارس بیغما بُردند — تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

زباندانیِ فارسی میری ازلی دستگاہ، اور یہ عطیۂ خاص مِن جانب اللہ ہے - فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ اس عبارت کو "معنی آفرینی بمعنی شاعری" کی تائید میں کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے! قاطع برہان میں کہتے ہیں کہ "من آیینِ معنی آفرینی .... از وَی فراگرفتہ ام" یعنی میں اس سے پہلے "معنی آفرینی" سے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا - نامۂ غالب میں ہے کہ "فارسی زباندانی میری ازلی دستگاہ" اور اس "کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا" تھا، لیکن اس زبان میں "مشق کا کمال" میں نے استاد کی صحبت سے حاصل کیا - یہاں صریحاً فارسی زباندانی یعنی زبان و الفاظ اور معانی و بیان سیکھنے کا ذکر ہے، نہ کہ شاعری کی تعلیم کا - غرض "معنی آفرینی" سے ان کی مراد "نکتہ آفرینی" ہے یعنی زبان اور الفاظ کی باریکیوں کے سمجھنے کی قابلیت۔

اس سوال پر ایک اور پہلو سے بھی گفتگو ہو سکتی ہے :
اگر "معنی آفرینی" کے معنی "شاعری" لیے جائیں، تو یہ ماننا پڑیگا کہ غالب، ملا عبدالصمد کے قیام

۱۶- ایضاً (نامۂ غالب) : ۲۴۸

۱۷- احوال غالب : ۲۶۳ ؛ نیز ایضاً : ۲۳۴ (حاشیہ ۷)

آگرہ کے دوران میں شعر کہنے لگے تھے اور شعر بھی فارسی میں۔ غالب کی دی ہوئی تاریخ کے مطابق یہ زمانہ ۱۲۲۶ - ۱۲۲۸ھ کے دو سال ہونگے (دوسرے لفظوں میں ۱۸۱۰/۱۸۱۱ء - ۱۸۱۲/۱۸۱۳ء)۔ کیا ہمارے پاس اس کی تائید میں کوئی شہادت موجود ہے؟ نہ صرف اس کا جواب نفی میں ہے، بلکہ جو کچھ ہم جانتے ہیں، وہ اس کے عین مخالف ہے۔

غالب کے دیوان کا جو خطی نسخہ ۱۹۶۹ء میں ملا تھا، وہ اس وقت تک ان کے کلام کا قدیمترین مجموعہ ہے۔ اس میں اردو کا مکمل مردّف دیوان ہے؛ اور اس کے ساتھ فارسی کی ۱۳ رباعیاں ہیں، اور یہ ظاہراً اس وقت تک کا جملہ کلام تھا؛ اس میں کوئی فارسی غزل نہیں ہے۔ اس نسخے کی تاریخ کتابت مولانا عرشی نے ۱۲۳۱ھ متعین کی ہے؛ بعض اور اصحاب نے اس سے بعد کی تاریخیں تجویز کی ہیں۔ اگر ۱۲۳۱ھ ہی کو درست تسلیم کر لیا جائے، تو کہنا پڑیگا کہ ملّا عبدالصّمد کے قیامِ اکبر آباد کے دو سال اور اس کے یہاں سے چلے جانے کے بعد کے تین ملا کر پانچ برس میں لے دے کے ۱۳ رباعیاں ان کی فارسی شاعری کی کل کائنات تھی۔ اگر انھوں نے عبدالصّمد سے شاعری کی تعلیم حاصل کی ہوتی، تو کیا یہی اسس کا نتیجہ ہوتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ۱۲۲۶ تا ۱۲۲۸ھ تو درکنار، کلکتہ جانے تک بھی ان کی فارسی شاعری کا سرمایہ ناقابلِ اعتنا تھا۔ "گلِ رعنا" میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ نہیں تھیں، اور ان میں سے بیشتر بھی اسی سفر کے دوران میں کہی گئی تھیں۔ اگر انھوں نے فارسی میں شعر گوئی عبدالصّمد کے قیامِ اکبر آباد کے زمانے میں شروع کر دی تھی، تو وہ سارا کلام کیا ہوا؟ گلِ رعنا کے بہرۂ فارسی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> از انجا کہ ہنوز ایں گہرہای شاہوار را بر رشتۂ نمطِ حروفِ تہجی نکشیدہ ام، و ایں اوراقِ پراگندہ را شیرازۂ جمعیتِ تدوین بستہ، فرو ہیدہ فرہنگاں بجز دی پنیرہ و سنجیدہ آہنگانِ موزونی اندیشہ، خُردہ بر بیربطیِ تحریر نگیرند، و عذرِ تنک سرمایگانِ فطرت و بیدماغانِ عالمِ فرصت بپذیرند۔

کیا جو شخص ۱۶ یا ۱۸ سال سے شاعری کر رہا ہے، وہ اسی طرح "تنک سرمایگی" کا عذر کیا کرتا ہے؟ غرض میرے نزدیک "معنی آفرینی" سے غالب کی مراد "شعر گوئی" نہیں تھی۔ اور انھوں نے "آفتاب عالمتاب" کے لیے اپنے حالات مہیا کرتے وقت، ان میں ملّا عبدالصّمد کا ذکر نہیں کیا، تو یہ عین تذکروں کی روایت کے مطابق تھا کیونکہ ان میں عام طور پر اس استاد کا ذکر ہوتا ہے، جس سے شاعر اپنے کلام پر اصلاح لیتا ہے۔

لیکن جب انھوں نے "قاطع برہان" تالیف کی، تو اب موضوعِ کلام بدل گیا تھا۔ اب شعرو سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں پر اصلاح لینے کا سوال نہیں تھا، بلکہ یہاں گفتگو، زبان اور الفاظ کی تحقیق اور معانی و بیان سے متعلق تھی۔ یہی وجہ تھی، کہ جب "قاطع برہان" میں انھوں نے بعض ایسی باتیں لکھیں، جو ان کے نزدیک نئی تھیں، تو انھوں نے لکھ دیا کہ یہ مجھے میرے استاد ملّا عبدالصمد سے معلوم ہوئی تھیں۔ یہ بالکل دوسری بحث ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ واقعی درست تھا یا نادرست؛ یا وہ اصل میں کوئی نیا نکتہ تھا بھی یا نہیں! بہر حال وہ ان کے نزدیک نیا بھی تھا اور درست بھی؛ اور انھوں نے اسے اپنے استاد ملّا عبدالصمد سے سنا تھا۔ اگر آج ہماری تحقیق سے یہ ثابت ہو جائے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ غلط تھا، تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالینگے کہ استاد اور شاگرد دونوں غلطی پر تھے۔ یا اگر وہ بات پہلے سے کسی اور مصنّف کے ہاں بھی ملتی ہے، تو ہم کہ سکتے ہیں کہ اس کی دریافت کا سہرا غالب یا ان کے استاد کے سر نہیں، اسے ان سے پہلے کا فلاں مصنّف لکھ گیا ہے؛ اگرچہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ غالب نے اسے پہلے مصنّف کے ہاں نہ دیکھا ہو، اور خود اپنے طور پر اسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ آخر دنیا میں توارد بھی تو کوئی چیز ہے! بلکہ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے جانے کو تیار ہوں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انھوں نے یہ نکتہ پہلے مصنّف کے ہاں واقع میں دیکھا ہو اور اس کے باوجود اسے "ایجادِ بندہ" کہ کر پیش کر دیا ہو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے، کہ ایک کثیر المطالعہ شخص کسی بات کو کہیں دیکھتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ ایک زمانے کے بعد اگر اسے کسی ضرورت سے، اسی موضوع پر غور و فکر کرنے یا لکھنے کا اتفاق ہو، تو بالکل قرینِ قیاس ہے کہ وہ اسی بات کو جو اس کا پیشرو لکھ چکا ہے (اور جسے وہ بھول گیا ہے کہ اس نے کہیں دیکھی تھی، لیکن جو بہر حال اس کے تحت الشعور میں موجود ہے) اپنی تحقیق اور اپنے دماغ کی اپج کہ کر پیش کر دے۔ شاید ایک قانون کا ماہر اس شخص کو مجرم قرار دے، لیکن نفسیّات کا عالم اسے بےقصور ٹھہرائیگا۔

غالب کے بیان کے مطابق ملّا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰ - ۱۸۱۱ء) میں اکبر آباد پہنچے تھے۔ وہ دو برس ان کے مکان پر رہے اور ۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ء میں یہاں سے روانہ ہوئے۔ غالب نے "قاطع برہان" اس کے ۵۰ برس بعد دورانِ غدر میں تالیف کی اور یہ طرح طرح کے ردو بدل کے مراحل سے گزر کر ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ عین ممکن ہے کہ نصف صدی کی اس طویل مدّت میں وہ استاد کے الفاظ بھول گئے ہوں۔ نہ صرف یہی، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے نادانستہ کچھ ایسی باتیں بھی استاد سے منسوب کر دی ہوں، جو انھوں نے فی الواقع نہیں کہی تھیں۔

ہم کسی مجلس میں ایک شخص سے کچھ سنتے ہیں؛ اور باہر جاکر اسے دہراتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ، یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ روایت ہو بہو انھیں الفاظ میں ہو، جس طرح اس شخص نے کہے تھے۔ یہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے۔ اگر اتنے تھوڑے وقفے کا یہ حال ہے، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پچاس برس بعد کیا صورت ہو گی! اب مرورِ زمانہ کے ساتھ نہ صرف الفاظ، بلکہ مطالب کے بھول جانے؛ اس اثنا میں ذاتی مطالعے اور ہر طرح کے لوگوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے؛ اپنے ذاتی غور و فکر کے نتائج کا اثر ـــــ غرض ان سب باتوں کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیا غالب ان سب امیال و عواطف سے مستثنیٰ اور محفوظ قرار دیے جا سکتے ہیں؟ انھوں نے استاد سے کچھ سنا، پچاس برس بعد اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے بیٹھے، تو کیسے ممکن ہے کہ وہ سب کچھ اسی طرح لکھنے پر قادر ہو گئے ہوں، جیسا انھوں نے سنا تھا۔ خود قاضی صاحب بھی غالب کے حافظے کے کچھ ایسے قائل نہیں نظر آتے۔

بیشک، غالب نے بعض ایسی باتیں اپنے استاد کے حوالے سے لکھی ہیں، جو غلط ہیں مثلاً نشیتن اور پوشتن کی بحث۔ اس میں انھوں نے فاش غلطی کی ہے۔ اور غالباً بعد کو انھیں اس کا احساس بھی ہو گیا تھا کیونکہ "مؤیّدِ برہان" کا جواب (تیغ تیز) لکھتے ہوئے انھوں نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بعض اور تسامحات بھی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس صورت میں ہم غالب کے سہو اور غلطی کے لیے استاد کو کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور اگر غالب نے ٹھیک روایت کی تھی اور واقعی استاد نے انھیں جو کچھ سکھایا تھا، وہ آج علم کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں اترتا، تو ہم اس سے استاد کے وجود سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں؟ اس صورت میں صحیح طریقہ یہ ہو گا کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ استاد واقعتاً اتنا قابل یا عالم فاضل نہیں تھا، جتنا اس کا شاگرد بتا رہا ہے۔

قصہ کوتاہ، اگر غالب نے "قاطع برہان" میں، ملا عبدالصمد کے حوالے سے، بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جو غلط ہیں، یا جنھیں ان سے پہلے کا کوئی اور مصنّف بھی لکھ گیا ہے، تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتایا، وہ غلط تھا، اور شاگرد کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ بات غلط ہے، ورنہ وہ کیوں اسے بھری دنیا میں شائع کر دیتا اور اپنی اور اپنے استاد کی رسوائی کا سامان مہیّا کرتا۔ لیکن اس سے آپ یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا اور شاگرد نے اپنے دماغ سے یہ بات گڑھ لی تھی۔

(۹) ایک اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے بھی ملّا عبدالصّمد کا ذکر نہیں کیا۔ اور ان کے

نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ " غالب نے قاطع کی تصنیف سے پہلے کسی سے زبانی بھی عبدالصمد کے ہندوستان آنے اور اس سے مستفید ہونے کا ذکر نہیں کیا " اوّل تو یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی مصنّف، اپنے موضوع سے متعلق پوری تحقیق نہیں کرتا، یا باوجود کوشش کے اسے پوری معلومات حاصل نہیں ہوئیں اور اس لیے اس کی تحریر نامکمل اور تشنہ رہ جاتی ہے، تو جو چیزیں اس کے حیطۂ بیان سے باہر رہ گئی ہیں، وہ ناپید نہیں ہو جاتیں۔

لیکن امرِ واقع یہی ہے کہ اس دور میں کوئی ان تفصیلات میں جاتا ہی نہیں تھا۔ سوائے خوب چند ذکا اور قطب الدین باطن کے، کسی نے مولوی محمد معظم کا بھی ذکر نہیں کیا۔ باطن آگرہ ہی کے رہنے والے تھے؛ غالباً انھوں نے مقامی طور پر غالب کے مولوی محمد معظم کے مکتب میں تعلیم پانے کا حال سنا ہوگا؛ اس لیے انھوں نے ان کا نام لکھ دیا۔ اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کے لب و لہجہ سے صاف عیاں ہے کہ ان کا مقصد مولوی محمد معظم سے زیادہ غالب کو نظیر کا شاگرد ثابت کرنا ہے۔ ذکا کو بھی مولوی محمد معظم کا حال شاید آگرے ہی میں معلوم ہوا ہو۔ ان دو مصنفوں کے علاوہ اور کسی نے مولوی محمد معظم کا ذکر نہیں کیا۔ بفرضِ محال یہ دونوں تذکرے ناپید ہو جاتے اور ہماری ان تک دسترس نہ ہوتی، تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ غالب نے مولوی محمد معظم سے بھی تعلیم نہیں حاصل کی تھی یا مولوی محمد معظم کا خارج میں وجود نہیں تھا! عدمِ ذکر یا عدمِ علم، عدمِ شے پر دلالت نہیں کرتا؛ یہ غلط منطق ہوگی۔ مثال کے طور پر شیفتہ کا تذکرہ گلشن بیخار لیجیے۔ نہایت مستند تذکرہ ہے اور مصنّف خود آخری دور کے کئی شاعروں کا معاصر اور دوست اور جلیس ہے۔ لیکن کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

(الف) آزردہ، مفتی صدرالدین خان۔ ان کے تقریباً ہر روز کے ملنے والے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان کے شرفِ صحبت سے لذت اندوز نہ ہوں۔ ان کے علم و فضل اور زہد و ورع کی تعریف میں ڈیڑھ صفحہ لکھا ہے۔ لیکن نہ خاندان کا حال؛ نہ تعلیم کا؛ نہ والد کا نام؛ نہ استادوں کا۔

(ب) ذوق، شیخ ابراہیم۔ ان کے حالات میں نصف صفحہ لکھا ہے۔ والد کا نام ندارد؛ تعلیم کے بارے میں خاموش۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے کلام پر اصلاح لینے کا بھی ذکر نہیں۔

(ج) سرور، اعظم الدولہ نواب میر محمد خان خلف الصدق نواب ابوالقاسم خان شاگرد محمد جان بیگ سامی (مزید حالات ندارد)

(د) شہیدی تخلص، کرامت علی نام، باشندۂ لکھنؤ۔ (اس سے زیادہ حالات اور تعلیم کا ذکر نہیں)
(ہ) ظفر، مرشد زادۂ آفاق، مرزا ابوظفر بہادر، ولی عہدِ سلطانِ زماں حضرت محمد اکبر شاہ۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش زلّہ ربا و وظیفہ خوار است (اس کے علاوہ تعلیم کا ذکر نہیں)
(و) غالب، اسداللہ خان المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندانِ فخیم است و از رؤسائے قدیم (نہ والد کا نام، نہ تعلیم کا حال)
(ز) ممنون، نظام الدین نام، ہمین پور قمرالدین منّت است (تعلیم وغیرہ کا ذکر نہیں)
(ح) مومن۔ دو صفحے کے حالات میں تعلیم کا تو کیا ذکر، والد تک کا نام نہیں۔
(ط) نصیر۔ شاہ نصیرالدین، خاندان کے حالات، والد کا نام، تعلیم اور اصلاح سے متعلق کچھ نہیں۔
(ی) اور تو اور خود اپنے حالات میں بھی مومن سے شاگردی کا تو لکھا ہے، باقی ندارد۔
میں نے قصداً صرف ان شاعروں کے حالات سے اعتنا کیا ہے جن سے شیفتہ کے ذاتی تعلقات تھے، اور جن سے انھیں اکثر ملنے جلنے کا اتفاق رہتا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ حالات کس قدر مختصر اور نامکمّل ہیں۔ اس پہلو سے پرانے تذکرہ نگاروں سے شکایت بیجا ہے۔ وہ بھی کیا کرتے، یہی اس زمانے کا رواج تھا۔ اب اگر ان حضرات کے مُلّا عبدالصمد کا نام نہ لکھنے سے ہم یہ نتیجہ نکالنے لگیں، کہ اس شخص کا وجود خارج میں نہیں تھا، تو ماننا پڑیگا کہ ہمارے کئی شاعر حضرت مسیح ناصری کی طرح بِن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔
لیکن حقیقت وہی ہے، جو میں اوپر لکھ چکا ہوں، کہ تذکروں میں صرف اس استاد کا ذکر کیا جاتا تھا، جس سے صاحبِ ترجمہ اپنے کلام پر اصلاح لیتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کسی مصنّف نے غالب کے استاد کا نام نہیں لکھا۔ کیونکہ سب جانتے تھے، کہ انھوں نے کسی کو اپنا کلام دکھایا ہی نہیں۔

مولانا حالی لکھتے ہیں:[۱۸]

> اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ "مجھ کو مُبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے"۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔

یہ ایک معاصر کا بیان ہے اور معاصر بھی ثقہ اور صائب رائے۔ جب تک حالی نے اور ذرائع سے اپنے

۱۸- یادگارِ غالب: ۲۶

بیان کی درستی کے لیے کافی ثبوت فراہم نہیں کر لیا ہوگا۔ وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ غالب نے جو کچھ کہا، وہ اپنی جگہ، لیکن واقع یہ ہے کہ اس نام کے ایک شخص سے انھوں نے فارسی ضرور پڑھی تھی۔
جو لوگ میرزا کی افتادِ طبع سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں، کہ انھیں خلافِ واقع باتیں بنانے میں اور لطیفے چھانٹنے میں لطف آتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی زندگی کا ایک اور واقعہ لیجیے![19]
ایک مرتبہ بہادر شاہ ظفر نے دربار میں ان کے شیعی ہونے کا ذکر کیا۔ مرزا کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی۔ حال آنکہ یہ امرِ واقع تھا اور سب اسے جانتے تھے، لیکن انھوں نے جھٹ سے پانچ رباعیاں لکھ کے اس سے تحاشی کی۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل ایک رباعی حالی نے یادگارِ غالب میں نقل کی ہے:[20]

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری کہتے ہیں مجھے وہ، رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی! شیعی کیونکر ہو، ماوراءالنہری!

لیکن سب لوگ جانتے تھے کہ وہ شیعی اور اثنا عشری ہیں۔ یہ بات ہنسی میں اڑ گئی۔ اسی طرح اگر کبھی انھوں نے بےتکلف دوستوں کے حلقے میں یہ چھینٹا اڑایا کہ اجی کون شاگرد، اور کہاں کا استاد! وہ تو لوگ مجھے بے استاد ہونے کا طعنہ دیتے تھے، میں نے ان کے لیے ایک استاد پیدا کر لیا۔ تو جاننے والے اسے بھی ان کے دوسرے لطیفوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ہونگے۔ اس سے ان کی راست گفتاری پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ یہ بھی ان کی معمولی فقرہ بازی کا ایک نمونہ ہے۔
پروفیسر محمد عبدالغفور شہباز نے نظیر اکبرآبادی کی سوانحعمری لکھی تھی۔ چونکہ باطن کی طرح وہ بھی غالب کے تلمذِ نظیر کے قائل تھے، اس لیے انھوں نے اس نظریے کی تصدیق کے لیے دلّی کے بعض اصحاب سے استفسار کیا۔ ان میں حکیم غلام رضا خان بھی تھے، جن کے غالب سے بہت یگانگت کے تعلّقات تھے۔ حکیم غلام رضا خان نے جواب میں لکھا:[21]

> بابت مرزا غالب و نظیر کے جو دریافت فرمایا ہے، اس کی مطلقاً اصلیت نہیں۔ صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا، نہ اردو۔ یہ جو مرزا صاحب ہرمزد ثم عبدالصمد کو اپنا اوستاد لکھتے ہیں، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا۔

۱۹- یادگار غالب: ۸۷

۲۰- بقیہ چاروں رباعیاں بھی مل گئی ہیں، لیکن ان کے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۱- زندگانیِ بےنظیر: ۲۰۰

چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب دہلی میں آئے؛ پھر یہیں رہے۔ اس زمانہ میں دہلی میں شاہ نصیر کا بہت شہرہ تھا۔ بلکہ مرزا صاحب کے خسر الٰہی بخش خان معروف بھی انھی کے شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نے اپنا کلام نصیر تک کو تو دکھایا نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم غلام رضا خان نے بھی قاضی صاحب کی طرح، میرزا کے ایک مذاق کو سنجیدگی پر محمول کر لیا ہے۔ بلکہ حکیم صاحب کے بیان میں کسی حد تک تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ غالب نے کہیں یہ نہیں کہا، کہ میں نے اپنا فارسی کلام، ملا عبدالصمد کو دکھایا تھا۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ میں نے ابتدا میں دو برس تک ان سے فارسی زبان پڑھی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ کلام دکھانے اور زبان پڑھنے میں بہت فرق ہے۔ حکیم غلام رضا خان کے مندرجۂ صدر بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے، گویا وہ اس بات کی تردید کر رہے ہیں کہ غالب نے ملا عبدالصمد کو اپنا کلام دکھایا تھا۔

حکیم غلام رضا خان نے حالی کے مقابلے میں اپنے آپ کو غالب کا زیادہ محرم راز اور شہباز کے لیے زیادہ قابلِ اعتماد ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے خط میں یہ فقرہ بھی لکھا ہے[۲۲] کہ حالی تو "گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے، ان کی وہاں نشست زیادہ نہ تھی"۔

حالی پہلی مرتبہ ۱۸۵۴ء میں دلی گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷-۱۸ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں[۲۳]:

> جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا، مرزا اسداللہ خان غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو اور فارسی کے دیوان کے اشعار، جو سمجھ میں نہ آتے تھے، ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا؛ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی، تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

آپ اس سے دیکھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب نے حالی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ کس حد تک

۲۲- زندگانیِ بےنظیر: ۲۰۲

۲۳- کلیاتِ نثرِ حالی: ۳۳۷

ٹھیک ہے۔ اس زمانے میں حالی دلی میں ڈیڑھ برس کے قریب رہے اور ۱۸۵۵ء کے آخر میں عزیزوں اور بزرگوں کے مجبور کرنے پر پانی پت واپس چلے گئے۔ کوئی سال بھر حصار میں ملازمت کی اور ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ بپا ہوا، تو پھر مکان پر آگئے، اور تقریباً چار برس وہاں سے نہیں نکلے۔ ۱۸۶۱ء میں انھیں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے اپنے ہاں بلالیا اور اس کے بعد شیفتہ کی وفات تک ان کی مصاحبت میں رہے۔ شیفتہ کا قیام یا تو اپنی جاگیر جہانگیر آباد میں رہتا تھا، یا دلی میں؛ اور وہ دلی اکثر آتے رہتے ہوںگے، یہاں ان کی دو حویلیاں تھیں۔ وہ جب بھی دلی آتے، حالی ان کے ساتھ آتے۔ دورانِ قیامِ دلی میں ان کی غالب سے ملاقات اور ان سے استفادے کے کئی واقعات یادگارِ غالب میں بھی درج ہیں۔

اس صورت میں غلام رضا خان صاحب کا یہ کہنا کہ حالی "گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے، ان کی وہاں نشست زیادہ نہ تھی" کے کیا معنی لیے جائیں؟

قاضی صاحب قبلہ نے حکیم غلام رضا خان کے غالب سے قریبی تعلقات اور انھیں بقول شہباز "گویا غالب کے متبنیٰ (ہونے) اور مرزا کے حالات سے بہت واقف" ثابت کرنے کے لیے غالب کا ایک خط بھی دیا ہے۔ غالب نے حکیم صاحب کو لکھا ہے[۲۴]:

> نورِ دیدہ و سرورِ دل و راحتِ جان، اقبال نشان حکیم غلام رضا خان کو غالبِ نیمجان کی دعا پہنچے..... سنو صاحب، میں فقیرِ آزادہ کیش ہوں؛ دنیادار نہیں، مکار نہیں، خوشامد میرا شعار نہیں! جس میں جو صفات دیکھتا ہوں، وہ بیان کرتا ہوں۔ نواب صاحب[۲۵] تو گھر بیٹھے مجھے سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں، تم مجھے کیا دیتے ہو، جو تمہارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بمثل میرا کوئی صُلبی بیٹا ایسا ہوتا جیسے تم ہو، تو میں اس کو اپنا فخر و شرف جانتا۔ علم و عقل و خُلق و صدق و سداد و حلم کے جامع، تورع و زہد و تقویٰ کے حاوی؛ علمِ اخلاق میں حکماءِ روحانی نے سعادت کے جو مدارج لکھے ہیں، وہ سب تم میں پائے جاتے ہیں۔ پروردگار تم کو عمرِ طبعی عطا کرے اور دولت و اقبال شمار سے زیادہ دے۔ ان شاء اللہ کہ ہمچنیں خواہد بود۔

۲۴- اردوی معلیٰ: ۳۳۴

۲۵- اس سے نواب کلب علی خان والیِ رامپور مراد ہیں۔ میرزا نے یہ خط اپنے دوسرے سفرِ رامپور کے دوران میں (نومبر/دسمبر ۱۸۶۵ء) رامپور ہی سے لکھا تھا

واقعی بہت یگانگت اور محبت کا خط ہے؛ اور اسی سے پروفیسر شہباز مرحوم اور جناب قاضی صاحب قبلہ کو حکیم صاحب کو غالب کا متبنیٰ کہنے کا موقع ملا۔ لیکن غالب کا یہ رویہ کچھ حکیم غلام رضا خاں ہی سے مخصوص نہیں تھا، وہ اپنے تمام شاگردوں اور احباب کو بمثل اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اور ان کی خوبیوں اور صفات کی فراخدلی سے تعریف کرتے تھے۔ دیکھیے، ماسٹر پیارے لال کو لکھتے ہیں[۲۶]:

فرزندِ ارجمند، اقبال بلند، بابو ماسٹر پیارے لال کو غالبِ ناتواں، نیمجان کی دعا پہنچے۔ لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ بھیجا، اس کی میں متنی شکایت کروں، بجا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمھارا عاشق ہوں، اور کیونکر نہ عاشق ہوں! صورت کے تم اچھے، سیرت کے تم اچھے، شیوہ وروش کے تم اچھے؛ خالق نے خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہیں۔ اگر میرا صُلبی فرزند ایسا ہوتا، تو میں اوس کو اپنا فخرِ خاندان سمجھتا۔ اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو "اوس قوم اور اوس خاندان کے ذریعۂ افتخار ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔

اگر پہلے خط سے یہ استنباط کیا جائے کہ حکیم غلام رضا خان "گویا غالب کے متبنیٰ" تھے، تو اس خط سے بابو پیارے لال کے بارے میں کیا کہا جائیگا! الفاظ، تراکیب، اسلوبِ تحریر، غرض کسی لحاظ سے بھی دونوں خطوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ ماسٹر پیارے لال دہلی سوسائٹی کے سکتر تھے جب وہ کیوریٹر ہو کر لاہور جانے والے تھے، تو انھوں نے سوسائٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ سوسائٹی کے جس جلسے میں ان کا استعفیٰ پیش ہوا تھا، اس میں غالب بھی موجود تھے۔ ماسٹر صاحب موصوف کو اس موقعے پر ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا؛ اور اس پر حاضرین نے دستخط کر دیے تھے۔ غالب نے دستخط کرتے وقت سپاسنامے پر یہ عبارت بھی لکھی تھی[۲۷]:

فقیر اسداللہ خان غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا جو غم واندوہ ہوا ہے، جی جانتا ہے۔ بس، اب میں نے جانا کہ میرا دلّی میں کوئی نہیں ہے۔

اسی طرح تفتہ کو لکھتے ہیں[۲۸]:

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں...

۲۶۔ اردوی معلیٰ: ۳۳۵-۳۳۶

۲۷۔ احوال غالب: ۱۹۰-۱۹۱

۲۸۔ خطوط غالب: ۱۷؛ اردوی معلیٰ: ۵۵-۵۶

سنو صاحب، یہ تو تم جانتے ہو کہ زین العابدین خان مرحوم میرا فرزند تھا، اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمّل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس، تمھارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے..... میں تنگ نہیں آتا، تو ان معنوی پوتوں سے.... کیوں گھبراؤنگا؟

یہاں تفتہ کو "اپنے فرزند کی جگہ" دی ہے، یعنی میرزا زین العابدین خان مرحوم کے برابر کہا ہے۔ ان کا یہی رویہ بعض اور شاگردوں مثلاً جواہر سنگھ جوہر، احمد حسین میکش وغیرہ کے ساتھ بھی تھا۔ غرض غالب نے جو خط حکیم غلام رضا خان کو لکھا ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ غالب کے بمنزلۂ متبنّٰی تھے، میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہوگا۔

رہا حکیم صاحب موصوف کا یہ لکھنا کہ عبدالصمّد" کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہیں تھا"، تو ہمیں اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جہاں تک غالب کے عبدالصمّد کو فرضی نام کہنے کا تعلق ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مولانا حالی نے بھی یہی لکھا ہے۔ وہ بھی تو یہی فرماتے ہیں کہ "کبھی کبھی غالب کی زبان سے سنا گیا ہے"۔ اس لیے اس قول کی اہمیت جناب قاضی صاحب قبلہ کے اتنا کہہ دینے سے تو نہیں بڑھ جاتی کہ "غالب کے مخصوصین نے خود غالب کی زبان سے سنا تھا کہ عبدالصمد وجودِ خارجی نہیں رکھتا"۔[29] کیا یہ ممکن نہیں کہ حالی نے بھی یہ بات کسی مجلس میں خود غالب کی زبان سے سنی ہو، یا کسی اور معتبر سامع (مثلاً حکیم غلام رضا خان ہی) نے ان تک یہ بات پہنچائی ہو! اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم حکیم صاحب کے بیان کو حالی پر ترجیح دیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالی لکھتے ہیں[30] کہ

> عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔

بس، جب تک جناب قاضی صاحب قبلہ یہ نہ بتائیں کہ ان کے پاس غالب کے ایک ثقہ معاصر کے بیان کو جھٹلانے کے لیے کیا برہانِ قاطع ہے، ہم کیسے ان کی مان لیں!

۲۹- احوال غالب: ۲۵۱

۳۰- یادگار غالب: ۲۶

یہاں تک تو میں نے ان دلائل پر گفتگو کی ہے، جو جناب قاضی صاحب موصوف نے ملّا عبدالصمد کو فرضی وجود ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہیں۔ یہ منفیانہ پہلو ہے، یعنی میری نظر میں ان کی کوئی دلیل بھی مسکت نہیں اور ان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ملّا عبدالصمد کوئی آدمی نہیں تھا لیکن ہمارے پاس ایک ایسی دلیل بھی ہے، جو میرے نزدیک مثبت حکم رکھتی ہے اور جس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں[۳۱]:

> نواب مصطفیٰ خان مرحوم کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ لکھا تھا: اے عزیز، چہ کسی، کہ بایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گذری۔

اس پر جناب قاضی صاحب نے یہ تبصرہ فرمایا ہے[۳۲]:

> قابلِ توجہ باتیں یہ ہیں کہ حالی نہ تو یہ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ خان خود حالی سے ناقل تھے اور نہ یہ کہ انھوں نے عبدالصمد (کا) خط خود دیکھا تھا۔ مصطفیٰ خان ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کی ملاقات غالب سے ۱۲۵۰ھ سے کچھ قبل ہوئی ہے۔ اگر عبدالصمد اصلی شخص ہوتا، تو اس وقت وہ ۹۰ کے لپیٹ میں ہوتا، اور ایک غیر ملک سے اس زمانے میں مراسلت خارج از بحث ہوتی۔

جناب قاضی صاحب نے شیفتہ کی تاریخ ولادت ۱۲۲۳ھ لکھی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں، شیفتہ کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تاریخِ ولادت ۱۲۲۴ھ تھی؛ یہی قابلِ ترجیح ہے[۳۳]۔ دیگر وہ لکھتے ہیں کہ شیفتہ سے غالب کی ملاقات ۱۲۵۰ھ سے کچھ قبل ہوئی ہے اور اس وقت عبدالصمد کی عمر ۹۰ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ تخمینہ انھوں نے لطائف غیبی کے ایک لطیفے سے لگایا ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ ملّا عبدالصمد نے علماے عرب و بغداد سے پچاس برس علومِ عربیہ پڑھے تھے۔ اس پر لکھتے ہیں[۳۴]:

> غالب نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۲۲۶ھ میں اس کی کیا عمر تھی۔ لیکن جس شخص نے پچاس برس علماے

۳۱۔ ایضاً: ۲۷

۳۲۔ احوال غالب: ۲۵۰

۳۳۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (دیباچہ): ۴؛ گل رعنا: ۳۲۶۔ دونوں جگہ ۱۲۲۱ھ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

۳۴۔ احوال غالب: ۲۳۵

عرب و بغداد سے تحصیلِ علم کی ہو، وہ اس وقت ۶۵ برس سے کم کا ہو، یہ قرینِ قیاس نہیں۔
اسی تخمینے کی بنا پر وہ لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۰ھ میں ملّا عبدالصمد کی عمر تقریباً ۹۰ برس کی ہوگی۔
انھوں نے غور نہیں فرمایا۔ "لطائفِ غیبی" کی عبارت میں پچاس سے مراد سو کا نصف نہیں، بلکہ طویل زمانہ ہے، کون شخص کس علم میں پچاس برس طالب علمی کریگا؟ نیز سیر و سیاحت کا موزوں زمانہ شباب کا دور ہوتا ہے، نہ کہ ۶۵ برس کی بڑھاپے کی عمر۔
لیکن حیرت، ان کے اس فقرے پر ہوتی ہے "حالی نہ تو یہ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ خان خود حالی سے ناقل تھے اور نہ یہ کہ انھوں نے عبدالصمد کا خط خود دیکھا تھا" یہ موشگافی کی حد ہے۔ حالی غریب "بیان حلفی"، تو لکھ نہیں رہے تھے کہ وہ "مجھ سے" کے الفاظ لکھ دیتے۔ اور بالفرض اگر شیفتہ نے یہ کسی اور سے بھی کہا ہو، تو کیا حرج ہے! دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ کیا انھوں نے یہ دعویٰ کیا تھا یا نہیں!

القصہ میرے نزدیک حالی کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:
(۱) مولانا حالی سے یہ روایت خود شیفتہ مرحوم نے بیان کی تھی
(۲) نواب شیفتہ فرماتے ہیں کہ ملّا عبدالصمد کے ایک خط میں یہ فقرہ لکھا تھا، جو اس امر کی دلیل ہے، کہ یہ خط انھوں نے دیکھا تھا۔
(۳) نواب شیفتہ کا اس خط کے ایک فقرے کو پورے کا پورا، اصلی لفظوں میں روایت کر دینا، دوسرا ثبوت ہے اس بات کا کہ انھوں نے یہ خط خود دیکھا تھا۔
(۴) خط کا وجود، اس کے لکھنے والے کے وجود پر دال ہے اور ثبوت ہے، ملّا عبدالصمد کے تاریخی شخصیت ہونے کا۔

اس پر جناب قاضی صاحب استہزا اور طنز فرماتے ہوئے کہتے ہیں[۳۵]:

> اس کے ساتھ اگر وہ (یعنی مالک رام) یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات بھی کی تھی، تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔

مجھے واقعی سخت حیرت ہے کہ انھوں نے ایک سنجیدہ گفتگو میں یہ لہجہ اختیار کیا!
ان کے اوپر کے اقتباس سے میں خیال کرتا ہوں کہ ان کے اعتراض دو ہیں۔ اول، اگر ملّا عبدالصمد یہاں سے ۱۲۲۸ھ میں چلا گیا تھا اور شیفتہ کی غالب سے ۱۲۵۰ھ کے قریب ملاقات ہوئی ہے،

۳۵- ایضاً: ۲۶۱

تو اتنی مدت تک خط و کتابت نہیں رہی ہو گی، خصوصاً جب کہ اس کی عمر تقریباً ۹۰ برس کی تھی۔
دوسرے "ایک غیر ملک سے اس زمانے میں مراسلت خارج از بحث ہوتی"۔ ۹۰ کی عمر کا تو میں
لکھ چکا ہوں، لیکن کیا واقعی احباب میں ۲۵ - ۳۰ برس تک خط و کتابت جاری رہنا اتنا ہی بعید
از قیاس ہے؟ ہاں، دوسرا اعتراض قابلِ توجہ ہوتا، اگر کوئی یہ کہتا کہ یہ خط ڈاک سے آیا تھا۔ لیکن یہ
کسی نے کہا ہی نہیں۔ اس زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ خط بھیجنے کے جو وسائل بھی تھے، وہی
استعمال کیے گئے ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ خط کوئی شخص دستی لایا ہو:

سچ پوچھیے، تو میری نظر میں خود یہ فقرہ بھی ملّا عبد الصّمد کے وجود کی دلیل ہے۔ اسے ملّا ہی کی طرح کا کوئی
بے ہمہ و باہمہ شخص لکھ سکتا ہے، اور کم از کم میرے نزدیک وہ کچھ اسی قسم کے انسان تھے۔ دوسری بات
ان کے اس فقرے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ خط بھی میرزا کو بہت دن کے بعد لکھا تھا یعنی
ان کے اس سے پہلے کے خط اور اس خط کے درمیان لمبا وقفہ گزرا تھا۔ واللہ اعلم۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مولانا حالی دونوں ثقہ اور معتبر راوی ہیں۔ ہم وہم بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں
کسی نے غلط بیانی کی ہو گی، یا واقعہ کے بیان میں "زیبِ داستان" کے لیے اپنی طرف سے کچھ اضافہ
کر دیا ہو گا۔ اگر ہم ایسی صریح اور متین شہادت پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے تو تاریخ اور مذہب کی کسی روایت
کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصراً اس کا مطلب
یہ ہو گا کہ ہم جب چاہیں، لفظوں کو توڑ مروڑ کے روزِ روشن کی سی حقیقت کا بھی انکار کر دیں۔

غالبؔ کی مُہریں

بڑوں کی ہر بات نرالی۔ وہی چیز جو ایک عامی کے تعلق سے بالکل معمولی اور ناقابلِ توجہ نظر آتی ہے، جب کسی بڑے آدمی کے ہاتھ میں پہنچتی ہے، تو اس کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بڑا آدمی اس چیز پر اپنی شخصیت اور مخصوص ذہنیت کے ایسے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ وہ اس کے کردار کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کی اہمیت زیادہ ہو جائیگی۔

مُہر ہی کو لیجیے، معمولی چیز ہے۔ اِدھر جب سے تعلیم اور لکھنے پڑھنے کا رواج زیادہ ہو گیا ہے، لوگ مُہریں کم بنواتے ہیں۔ ورنہ پہلے ہر خاص و عام مُہر بنواتا تھا، تعلیم یافتہ بھی اور ناتعلیم یافتہ بھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ نگینے پر نام کھُدوایا اور اسے خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر اور دوسری تحریروں پر ثبت کر دیا۔ اَن پڑھ صرف مہر ہی پر اکتفا کرتے، پڑھے لکھے اس کے ساتھ دستخط بھی کر دیتے۔ نگینے کی قیمت کا فیصلہ صاحبِ مُہر کی جیب اور ظاہری شکل و صورت کا اس کے ذوقِ حسن پر منحصر تھا۔ اس سے زیادہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔

مگر یہی معمولی چیز دیکھیے، ایک بڑے آدمی کے پاس پہنچ کر کیا سے کیا بن جاتی ہے! میرزا غالب نے اپنی عمر میں کتنی مہریں بنوائیں، یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اس وقت تک اُن کی چھ مُہروں کا پتا چلا ہے، جو انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں تیار کروائیں۔ مگر دیکھیے کہ ان میں سے ہر ایک ان کے ماحول، ان کے خیالات اور عام حالات کی ترجمان ہے یا نہیں!

۱۔ اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ : ۱۲۳۱ھ
میرزا غالب کی پیدائش ۱۲۱۲ھ میں ہوئی گویا یہ مُہر انھوں نے ۱۹-۲۰ برس کی

عمر میں کھدوائی۔ اس زمانے کا حال وہ ایک خط میں منشی شیونرائن کو یوں لکھتے ہیں![1]

تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے! مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا کے والد عہدِ "نجف خاں" و "ہمدانی" میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خان کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی، اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی، اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر (تمہارے دادا) "خان صاحب" کے ساتھ ہیں، اور انھوں نے جو کیتھم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا، تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے، شاید منشی بنسی دھر مجھ سے دو ایک برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں! انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اون کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی۔ چونکہ گھر اون کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور اون کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی، اور پاس اس کے "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کے ایک کٹرہ کہ وہ "گڈریوں والا" مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اوس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

ان کا یہ دور جس رنگین ماحول اور فضا میں گذرا، وہ اس خط کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔ ہر طرف روپے پیسے کی ریل پیل؛ بے فکری اور بیکاری۔ ان حالات میں جتنی لغویتیں ذہن میں آئیں، اتنی ہی کم ہیں۔ اسی زمانے یا اس کے تھوڑے دن بعد کے ایک واقعہ کی طرف ان کے ایک اور خط میں اشارہ موجود ہے؛ جو انھوں نے مرزا حاتم علی مہر کو اس کی محبوبہ کی وفات پر لکھا ہے[2]:

عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرح نصیب ہووے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی،

۱۔ اردوے معلیٰ: ۲۶۴-۲۶۵؛ خطوط غالب: ۲۲۴

۲۔ اردوے معلیٰ: ۱۸۸؛ خطوط غالب: ۳۶۳

تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اوس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں، اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری بھئی، مغلیچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں، اوس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغلبچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اون دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اوس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔

جب اس کے جواب میں مرزا حاتم علی مہر نے بہت جزع فزع کا اظہار کیا، تو میرزا نے ایک اور خط لکھا:[۳]

مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے؛ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں خط ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) کے لکھے ہوئے ہیں۔ چالیس بیالیس برس پہلے ۱۲۳۵-۱۲۳۷ھ میں ان کی عمر ۲۳-۲۴ برس کی ہوگی۔ غالب کے ابتدائی کلام میں ایک غزل مرثیے کے رنگ میں موجود ہے، جو غالباً اسی ستم پیشہ ڈومنی کی وفات پر کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری، ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری! ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری! ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری، ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا!
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی!
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری، ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے

۳- اردوئے معلی: ۱۹۰؛ خطوطِ غالب: ۳۶۳-۳۶۴

ساتویں شعر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خودکشی کرلی تھی اور یہ اس وجہ سے کہ رازِ محبت فاش ہوگیا تھا اور اس کے اقربا وغیرہ تک یہ بات پہنچ گئی تھی۔ اس غریب نے رسوائی کی شرم سے بچنے کے لیے موت کے دامن میں پناہ لی۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی رنڈی یا بازاری عورت نہ تھی ورنہ کہاں کی رسوائی اور کہاں کے اقربا!

غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خان کا عرف میرزا دولھا تھا۔ اسی لیے لوگ میرزا غالب کو بچپن ہی سے "میرزا نوشہ" کہنے لگے۔ اس عرف کی پستی ظاہر ہے اور خود میرزا کو بھی بعد کو اس "نالائق" عرف سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر اس طوفانی زمانے میں بھلا تفاہت کہاں قریب پھٹک سکتی تھی! یہ باتیں شعور اور تجربے سے حاصل ہوتی ہیں اور وہ ان کی عمر یا گردوپیش کا اقتضا نہ تھا۔

غرض کہ اس مہر سے ان کی اس زمانے کی سرمستی و رنگینی، رندی و ہوس پیشگی، بدرجۂ اتم ظاہر ہے۔

۲- اسداللہ الغالب ۱۲۲۱ھ

یہ پہلی مُہر اور اس مُہر کی تیاری کا زمانہ ایک ہی ہے۔ اس مُہر کی بنا حضرت علیؓ کا لقب ہے۔ چونکہ میرزا کا نام اسداللہ تھا، اس لیے انھوں نے اس رعایت سے بطورِ سجع یہ نام کھُدوالیا؛ اور بعد کو ان کے دوسرے تخلص کی بنا بھی یہی ہوئی۔ چونکہ سامنے کی چیز تھی، اس لیے جب انھوں نے تخلص تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تو اسد چھوڑ کر بلا تامّل غالب رکھ لیا۔ نام کی رعایت سے تخلص رکھنے میں میرزا کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اکثر شاگردوں کے تخلص اسی اصول پر رکھے گئے ہیں: ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں، شہاب الدین احمد خان ثاقب، یوسف علی خان عزیز، شمشاد علی بیگ خان رضوان، جواہر سنگھ جوہر وغیرہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے میرزا کو عقیدت ان کی فارسی کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے ۱۲۲۶ھ سے ۱۲۲۸ھ تک، دو برس ملّا عبدالصمد سے فارسی پڑھی اور ایران کے علوم و رسوم سے واقفیت حاصل کی۔ اسی سے انھیں شیعیت سے شغف پیدا ہوا مگر ان کی شیعیت میں ناگوار غلو اور تبرّائی شدّت

کبھی پیدا نہ ہوسکی ۔ نہ ان کے سنی احباب کی تعداد کم تھی، نہ ان سے مودت اور اخلاص میں کوئی نقص ۔ وہ ایک جگہ اپنے عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں[۴]:

میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں ۔ زبان سے لاالٰہ الاّ اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لاموجود الاّ اللہ اور لامؤثر فی الوجود الاّ اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت ۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں ۔ مقطع نبوت کا مطلعِ امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے؛ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود علیہ السلام ۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

پس یہ مہر محض سجع ہی نہیں بلکہ ان کے دلی خیالات و معتقدات کی مظہر ہے ۔

۳ - محمد اسد اللہ خان : ۱۲۳۸ھ

یہ معرکہ آرا مہر ایک عظیم الشان داخلی اور ذہنی انقلاب کی آئینہ دار ہے ۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں دلی کے علما بہت بڑے مذہبی مباحثے میں الجھ گئے ۔ دو فریق تھے ۔ ایک کا دعویٰ تھا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر ممتنع بالذات ہے، یعنی خداوندِ تعالیٰ اب ان کا نظیر پیدا کر ہی نہیں سکتا ۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ ممتنع بالذات نہیں، بلکہ ممتنع بالغیر ہے؛ اللہ تعالیٰ پیدا کر تو سکتا ہے یعنی اس میں یہ قدرت ہے، مگر اب وہ پیدا کریگا نہیں ۔ فریقِ اوّل کے نفسِ ناطقہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے، اور فریقِ ثانی کے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میرزا کی شادی خاندان لوہارو کے مشہور فرد نواب الٰہی بخش خان معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوچکی تھی؛ اور وہ آگرے سے نقلِ مکان کر کے مستقلاً دلی میں مقیم ہو گئے تھے ۔ مولانا فضل حق، میرزا کے نہایت عزیز دوستوں میں سے تھے ۔ مولانا نے ان سے فرمایش کی کہ وہ ان کے نقطۂ نگاہ کی تائید میں ایک مثنوی لکھیں ۔ یہ مثنوی میرزا کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے ۔ میرزا اس کے خاتمے میں لکھتے ہیں :

۴. اردوے معلی: ۳۲۸؛ خطوط غالب: ۳۹۲

صورتِ آرایشِ عالم نگر — یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
اینکہ میگویم جوابے بیش نیست — مہر و مہ زاں جلوہ تابے بیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید — می تواند مہرِ دیگر آفرید
حق دو مہر از سوے خاور آورد — کورِ ناداں کو نہ باور آورد
قدرتِ حق بیش ازیں ہم بودہ است — ہر چہ اندیشی کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از روے یقیں — خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں
یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃٌ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوبتر — یا بیک عالم، دو خاتم خوبتر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوی — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوی

ظاہر ہے کہ یہ فلسفیانہ استدلال مولانا فضل حق کو پسند نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیا کہتے ہو کہ لاکھ عالم ہوں، تو لاکھ ہی خاتم بھی ہو سکتے ہیں! بلکہ یوں کہو کہ اگر لاکھ عالم ہوں، تو بھی خاتم المرسلین ایک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہوگی۔ اس بیان کی خاطر سے انھوں نے آخر میں چند اشعار کا اضافہ کر دیا اور لکھا:

غالب! ایں اندیشہ نپذیرم ہمے — خوردہ ہم بر خویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ — دانم از رُوی یقینش خواندۂ
ایں الف لامی کہ استغراق راست — حکمِ ناطق معنیِ اطلاق راست
منشاءِ ایجادِ ہر عالم یکے ست — گر دو صد عالم بود، خاتم یکے ست

دیکھا جائے، تو غالب نے جو کچھ لکھا تھا، اس میں اعتراض کی گنجایش نہیں تھی۔ لیکن کیا کیا جائے، دوست کی فرمایش کا پاس بھی ضروری تھا۔ پس، اگرچہ اولاً انھوں نے وہی لکھا، جو ان کی طبعِ سلیم کا اقتضا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اصولاً بھی ٹھیک تھا، لیکن وقتی مصالح کو کیونکر نظر انداز کرتے! لہٰذا مولوی فضل حق کے کہنے پر انھوں نے اس بیان شعروں کا اضافہ کر دیا، جس سے صورت حال بدل گئی۔

بہر حال اس سے ایک بات تو عیاں ہو گئی کہ انھوں نے مذہب اور مذہبی امور میں دلچسپی لینا

شروع کر دیا تھا۔ اس میں دو محرک کارفرما ہوئے۔ اول، نواب الٰہی بخش خان کی عزیزداری، جو خود صوفی اور تصوف کے حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ ان کی مجلس میں لامحالہ ان کے کان میں دین کی باتیں پڑی ہوں گی۔ اور جوانی لاکھ دیوانی سہی، اور ان کی طبیعت کے لاابالیانہ پن سے بھی انکار ممکن نہیں؛ لیکن علم و عمل کے نمونے کا انسان پر قطعاً کوئی اثر نہ ہو، یہ بھی اصولِ فطرت کے خلاف ہے۔

دوسرا اثر: مولوی فضل حق خیرآبادی کا تھا۔ یہ تو آج تک نہیں کھلا کہ اول اول میرزا کا ان سے کب اور کیونکر تعلق قائم ہوا۔ لیکن کچھ بھی ہو، یہ امرِ واقع ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے مذہب میں شدید رویّے اور میرزا کی رندی اور آزادہ روی کے باوجود، دونوں کے تعلقات آخر تک بےحد یگانگت اور مودّت کے رہے۔ میرزا کے لیے ایسے مخلص دوست کی روک ٹوک نظرانداز کر دینا محال تھا۔

میرزا کی تحریروں سے ثابت ہے کہ وہ اس سے قبل فسق و فجور اور عیش و عشرت کی دلدل میں پھنس چکے تھے۔ لیکن اس نئے مذہبی ماحول نے اگر ان کی کایا بالکل پلٹ نہیں دی، تو کم از کم اس کی شدّت میں ضرور کمی آگئی، اور وہ اخلاقی قدروں کے بھی شناسا ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا: اسداللہ خان عرف میرزا نوشہ؛ اب انھوں نے جو نئی مہر تیار کروائی، اس پر لکھا ہے: محمد اسداللہ خان۔ کیا ان کی قلبِ ماہیّت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے!

۴۔ نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خان بہادر نظام جنگ : ۱۲۶۷ھ

دربارِ دہلی سے میرزا کے تعلقات اکبرشاہ ثانی کے عہد سے تھے۔ مگر یہ ایسے ہی تھے کہ کبھی کسی شادی کے موقع پر قطعۂ مبارکباد کہہ دیا یا کسی خاص تقریب سے قصیدہ حضورِ شاہ میں گزرانا۔ ان عارضی تعلقات کی باقاعدہ اور مستقل صورت کا سامان ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔ خود میرزا کے لیے یہ زمانہ نہایت عُسرت کا تھا۔ پنشن کے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ اُن کے اخراجات شروع سے رئیسانہ اور مُسرفانہ رہے تھے، جن میں کمی ممکن نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں آمدنی صرف پنشن کی ساڑھے باسٹھ روپے

ماہانہ۔ مزید براں مقدمے کے دوران میں جن ساہوکاروں نے انھیں اس امید پر قرض دیا تھا کہ جب مقدمے کا فیصلہ میرزا کے حق میں ہو گیا، تو وارے نیارے ہو جائینگے، اب بہ اصرار اپنا روپیہ واپس مانگ رہے تھے۔ ان حالات میں میرزا کے دوستوں نے مشورہ کیا، اور آخر یہ ٹھہری کہ کسی طرح میرزا کا قلعے سے تعلق پیدا ہو جائے اور بہادر شاہ کے دربار سے انھیں کچھ وظیفہ ملنے لگے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد نصیر الدین عرف میاں کالے اور احترام الدولہ معتمد الملک حکیم احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ مدار المہام و طبیبِ شاہی کی وساطت سے میرزا خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اقتباس کسی قدر لمبا ہے، مگر اس واقعہ کی رُوداد خود میرزا کی زبان سے سنیے اور ان کی فارسی کا لطف اٹھائیے۔ لکھتے ہیں[5]:

> دریں زمانہ کہ سایۂ دیوارِ حضرتِ شیخ الاسلام (مولانا محمد نصیر الدین عرف میاں کالے) مرایں خستہ تن را بسترِ خواب است و دیدۂ بیدارِ ایں فرو ماندۂ بندِ پندار رُوشناسِ کفِ پائے خسروِ ہلال رکاب، روزے بود فیروز و صبحے دل افروز، باد در وزیدن و سبزہ در چمیدن، بلبل بہ نوا خانی و زاہد بسبحہ گردانی، رہ نوردان بار بر بستہ و شب گرداں پائے بدامن شکستہ، روز از خجستگی بہ سعدِ اکبر نامزد بہ پنج شنبہ نامور، و لبست و سیوم شعبانِ سالِ یک ہزار و دو صد و شصت و شش ہجری با چہارمِ جون[6] سالِ یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ عیسوی برابر، مہر درخرگاہِ ماہ میہماں، و ماہ از نشیمنِ زہرہ میہمان را بمہر نگراں، کیوان بحمل در گام سنجی، و برجیس بہ سنبلہ در خرامش، مریخ در اسد با ناہید دمساز و عطارد در جوزا بہ تنہائی شادماں، شہنشاہ بشکوہے کہ پنداری، آفتاب است در بیت الشرف براورنگ نشستہ، و من بہ نشاطی کہ گوئی عطارد است در تصمیم رُو بر وا ایستادہ، کارپردازانِ شاہی بفرمانِ حضرتِ ظلِ الٰہی بخلعتخانۂ خاصم بردند، و تا مم را بہ خلعتِ شش پارچہ آراستہ بسلامگاہم آوردند۔ خداوند دنیا و دیں بداں دستِ بخشش آیین کہ کفِ آں دست دریائیست کہ ہفت دریا در کفِ اوست، جلگو شہ ہائے معدن جیغہ و سرپیچ بسرم بست، و رگِ جانِ ابر نیساں یعنی حمائلِ مروارید بگردنم آویخت۔ چاوشِ فرخ سروش گہر ہائے تر ادیدۂ رگِ ابرِ خامۂ شاہ پر دیں سیاہ بر گوشۂ بساطِ بارگاہ فشاند و غالبِ سخن سرائے را نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ خواند۔ بدیں مہر خوان کہ

۵۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۷۱؛ نیز ذکرِ غالب: ۹۶-۹۷

۶۔ یہاں سہوِ کتابت ہے؛ جون کی جگہ جولائی چاہیے (ذکرِ غالب: ۹۶)

از خورشیدِ ذرّہ پرور یافتم، خود را چوں گویم کہ با آفتاب ہر آینہ با عطارد برابر یافتم و توقیعِ خدمتِ تاریخ نویسیِ تاجدارانِ تیموریہ بنامِ من نگاشتند۔

۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کے اسعد الاخبار (آگرہ) میں یہ خبر درج ہے[7]:

ان دنوں شاہِ دین پناہ نے جناب معلیٰ القاب مرزا اسد اللہ خان غالب کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر، جو تیمور کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو، مامور کیا۔ اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواعِ پرورش کا متوقع کیا۔ اور "نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر، نظام جنگ" خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور رنگین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا۔

مرزا کے محبوب و مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے استادِ باکمال کی اس عزت افزائی کی تاریخ لکھی:

سراج الدین بہادر شاہِ غازی داد غالب را
خطابے، جوہرِ ہر لفظ آں روشن تر از اختر

دبیر الملک و نجم الدولہ یک جزو دیگر ہم
نظام اول بود، زاں بعد لفظِ جنگ اے سرور!

خطاب و خلعت و شش پارچہ بخشید بر خلعت
فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالا ے دُر و گوہر

بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسروِ دہلی
سخن فہم و سخن گو پرور دانا و دانشور

پے تحریرِ تاریخِ خطاب و خلعتِ شاہی
بدریاے تفکر غوطہ زد طبعِ سخن گستر

بہنگامے کہ شد در غوطہ یابش برزمیں قائم
بگوشِ تفتہ، ہاتف گفت کاے رندِ زباں آور

بگو، گر سالِ ایں پیش آمدِ اقبال می خواہی
یکے ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز، چارم فر

(ساماں، حشمت، اعزاز اور فر کے اعداد ۱۲۶۶ ہوتے ہیں[8])

یہ مہر اسی خطاب کے بعد، ۱۲۶۷ھ میں تیار کرائی گئی تھی۔

۷۔ بحوالہ اردو (اپریل ۱۹۳۵ء): ۹۳۔

۸۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کو مصرع تاریخ کے لفظ "فر" کے بارے میں کچھ شبہہ تھا۔ انھوں نے استاد کو لکھا اور اپنی تائید میں ظہوری سے سند پیش کی۔ اس پر غالب نے جواب میں جو خط لکھا تھا وہ اردوے معلیٰ (۳۵۹) اور خطوط غالب (ص ۱۲) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۵- یا اسداللہ الغالب: ۱۲۶۹ھ

یہ پانچویں مُہر گویا فریاد ہے ان کی بآوازِ بلند، اور درخواست ہے مدد کی اپنی مصیبتوں اور مشکلات سے نجات کے لیے۔ وہ اعتقاداً شیعی تھے؛ انھوں نے اپنے خاندان کی روایات کے خلاف یہ عقیدہ بہت چھوٹی عمر میں اختیار کر لیا تھا اور وہ حضرت علیؓ کو مشکل کشا مانتے تھے۔ اسی لیے جب وہ سب طرف سے مالی اور ذہنی پریشانیوں میں گھر گئے، تو انھوں نے اپنے دینی ملجا و ماوا کو مدد کے لیے پکارا۔

جیسا کہ معلوم ہے، انھیں ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ سرکارِ انگریزی سے پنشن کے بچپن سے، اور پچاس روپے ماہانہ دربارِ بہادر شاہ ظفر سے جولائی ۱۸۵۰ء سے مل رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے مُسرفانہ اطوار کو دیکھتے ہوئے اتنی سی رقم بالکل ناکافی تھی۔ اور اس کا ان کی ذہنی حالت پر ناگوار اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ "پراگندہ روزی، پراگندہ دل" پرانا مقولہ ہے۔

یہ مُہر انھوں نے ۱۲۶۹ھ[9] (۱۸۵۲-۵۳ء) میں بنوائی تھی۔ اب اسے خوش اعتقادی اور نیک نیتی کا کرشمہ خیال کیجیے، یا استجابتِ دعا کا ثبوت کہ اس کے بعد واقعی ان کے حالات میں بہتری کے وسائل پیدا ہو گئے۔ ۱۸۵۴ء میں کئی ایسے واقعات ہوئے، جنھیں ان کی مالی حالت سدھارنے اور ان کی انا کی تسکین کا باعث ہونا چاہیے۔

۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ظفر اپنے کلام پر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ غالب کو اپنی شعری برتری کا شدید احساس تھا۔ وہ بجا طور پر اپنے آپ کو ذوق سے بہتر شاعر خیال کرتے تھے، اور اسی لیے استادِ شاہ ہونے کا زیادہ مستحق بھی۔ لیکن چونکہ ظفر بہت ابتدا سے بلکہ اپنی ولی عہدی کے زمانے سے، ذوق سے مشورۂ سخن کرتے آئے تھے، اس لیے ذوق کی زندگی میں کسی اور کی دال گلنے کی کیا امید ہو سکتی تھی! اب جو ذوق نے رحلت کی، تو اور کون تھا، جسے غالب پر ترجیح دی جا سکتی تھی! اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ، عید ہوئی، ذوق! وائے شام کو۔ لیکن اس سے یقیناً

۹- یکم محرم ۱۲۶۹ھ مطابق ہے ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۲ء کے؛ اور یہ سال (۱۲۶۹ھ) ختم ہوتا ہے ۲ اکتوبر ۱۸۵۳ء کو۔

ان کی کچھ اشکشوئی ہوئی ہوگی۔

اسی سال ولی عہدِ سلطنتِ مغلیہ میرزا غلام فخرالدین رمز بھی غالب کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے؛ انھوں نے غالب کا چار سو روپیہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ غالباً ۱۸۵۴ء ہی میں ظفر کے سب سے چھوٹے بیٹے میرزا خضر سلطان نے بھی ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے بھی کچھ نہ کچھ مالی منفعت ضرور ہوتی ہوگی۔

میرزا کے سلطنتِ اودھ سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ جب وہ پنشن کا مقدمہ دائر کرنے کو کلکتے گئے ہیں، تو اس زمانے میں رستے میں پانچ چھ مہینے لکھنؤ میں رکے تھے۔ اس زمانے کی یادگار ایک فارسی قصیدہ اور ایک نثر ہمارے پاس موجود ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ یہ تعلقات پختہ تر ہوتے گئے اور انھوں نے مختلف شاہانِ اودھ کی خدمت میں قصیدے بھی پیش کیے۔ لیکن بات اس سے آگے بڑھی نہیں؛ انھوں نے ممدوح کی خدمت میں قصیدہ گزرانا؛ اور جو انعام یا خلعت ملنا تھا، مل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۴ء میں اس رسم و راہ میں کچھ زیادہ استواری پیدا ہوئی، اور واجد علی شاہ آخری بادشاہِ اودھ نے ان کا پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

قصہ کوتاہ، یہ مہر یادگار ہے، ان کے سقیم حالات کی؛ اور پیش رو ہے ان کے حالات کی بہتری کی۔

۶- غالب: ۱۲۷۸ھ

میرے علم میں میرزا کی یہ آخری مہر ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے سات برس پہلے ۱۸۶۲ء میں تیار کرائی۔ جو لوگ نفسیات سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ نفسِ انسانی میں "انا" کے ارتقا کا انتہائی "مقام" یہ ہے کہ انسان کسی غیر معمولی کامیابی کے بعد اپنے تعارف کے لیے مختصر سے مختصر "علَم" استعمال کرنے لگتا ہے!

۱۰- نپولین نے یورپ کی چار بڑی سلطنتوں کو آسٹرلٹز کے مقام پر ایسی شکستِ فاش دی تھی کہ جب یہ خبر انگلستان کے وزیر اعظم ولیم پٹ تک پہنچی، تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سکریٹری سے کہا کہ یورپ کا نقشہ جو سامنے دیوار پر آویزاں ہے، اسے لپیٹ کر رکھ دو۔ ہمیں آیندہ دس برس تک اِس کی ضرورت نہ ہوگی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب

(بقیہ اگلے صفحے پر)

۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء دونوں میرزا کی حیات کے نہایت اہم سال ہیں۔ وہ ساری عمر ہندستان کے فارسی دانوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ ان کے مکتوبات ان حضرات کی مخالفت سے بھرے پڑے ہیں۔ اُن کی نظر میں یہ سب "خرانِ امشتخص" تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز جیسے الفربہ خواہ نخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہی ہیں یہ کون ہے! ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا۔ فارسی سے ناآشنا محض، اور صرف و نحو میں ناتمام۔ انشاءِ خلیفہ و منشیاتِ مادھورام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں اپنا مآخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھورام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ رادِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے، یہ فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبعِ موزوں رکھتے تھے؛ شعر کہتے تھے۔"

ایک اور جگہ اس سے زیادہ جامعیّت کے ساتھ ہندستان کے فارسی دانوں پر تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کشور قلم و سخن طرازی ہے، یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرحِ سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے (مگر اس کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ دیکھو عبدالقادر کیا لکھتا ہے۔ رہے سپاہی فالیز، آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار و غیرہم انھیں میں آگئے۔ ناصر علی، بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا! ہر ایک کا کلام بنظرِ انصاف دیکھیے! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منّت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں! ایرانیوں کی سی ادا کہاں! فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیرویِ قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ

(پچھلے صفحے کا بقیہ)

یورپ میں کوئی ملک رہا ہی نہیں جس کی حدود دیکھنے کی ضرورت محسوس ہو کیونکہ اب یورپ میں صرف فرانس ہی فرانس رہ گیا ہے۔ اس نمایاں فتح کے بعد دیکھا گیا کہ کاغذات پر دستخط کرنے میں نپولین صرف (N) لکھنے لگا، حال آں کہ اس سے پہلے وہ نپولین یا بونا پارٹ لکھا کرتا تھا۔

وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی؛ اس شیوہ درویش کو خوب برت گئے، فارسی کو وہ کیا جانیں! قاضی محمد صادق اختر عالم ہو نگے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ! ایک بات حضرت کو اور معلوم رہے کہ ہندی فارسی دانوں نے کمال کو وہم میں منحصر رکھا ہے۔

لیکن اس تنقیص و تفضیح نے زیادہ واضح صورت ۱۸۵۷ء۔ ۱۸۶۰ء میں اختیار کی۔ جب ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا، تو میرزا بیشتر وقت اپنے مکان پر گزارنے لگے، نہ شہر چھوڑ کر بھاگے، نہ بغاوت میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں ان کے پاس چھاپے کی "برہانِ قاطع" کا ایک نسخہ تھا۔ یہ لغت کی مشہور کتاب مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی تالیف ہے اور اس کے مآخذ میں تمام پرانے لغتوں کے نام ہیں۔ میرزا نے دفع الوقتی کے لیے اس کی ورق گردانی شروع کی، تو دیکھا کہ اس میں بیسیوں غلطیاں ہیں۔ وہ ان مقامات پر نشان کرتے اور حاشیے میں اصلاح لکھتے گئے۔ بعد کو ان تمام حاشیوں کو جمع کر کے انھوں نے ایک مختصر رسالہ "قاطع برہان" مرتب کر لیا، اور جب اسباب میسر آ گئے، تو ۱۸۶۲ء میں اسے شائع کر دیا۔ اس کی اشاعت گویا ہندستان کے فارسی دانوں کو علی الاعلان عام دعوتِ مبارزت تھی، برہانِ قاطع نہایت مستند اور بلند پایہ تالیف خیال کی جاتی تھی۔ اس کے خلاف لب کشائی کے معنی یہ تھے کہ جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے، ہندستان میں کوئی شخص اور کوئی کتاب قابلِ استناد نہیں۔ اصحابِ تقلید و جمود بھلا کب یہ گوارا کر سکتے تھے! بقول میرزا یہ لوگ "برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے"۔ چھ برس تک ہندستان کے علمی حلقوں میں ایک ادھم مچا رہا اور یہ فتنہ جب فرو ہوا کہ ۱۸۶۹ء میں خود میرزا کی وفات ہو گئی۔

اگر اس تخریبی اقدام سے دوسروں کے علم و فہم کی پستی اور غلط روی کا اظہار منظور تھا، تو اس کے مقابلے میں ۱۸۶۲ء میں ایک تعمیری کام بھی ہوا۔ یعنی اسی سال ان کے کلیاتِ نظمِ فارسی کی طباعت شروع ہوئی، جس سے اپنے فضل و کمال کا دوسروں پر تفوق اور اپنی قدرتِ کلام کی شہادت پیش کرنا مقصود تھا۔ ان کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس پر سترہ اٹھارہ برس کا طویل زمانہ گذر چکا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ نایاب ہو چکا تھا، وہیں اس کے بعد کا کلام بھی ہنوز تشنۂ اشاعت پڑا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں منشی نول کشور مرحوم نے اپنے مشہور مطبع میں کلیات کی طباعت شروع کی، جو ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوئی۔

غرض کہ ۱۸۶۲ء - ۱۸۶۳ء میرزا کی زندگی میں نہایت اہم سال ہیں۔ "قاطع برہان" اگر دوسروں کی

شکست کا اعلان تھا، تو کلیات ان کی فتح مندی کا ثبوت۔ اسی سال ان کا اپنے نگین پر "غالب" کندہ کرانا اسی حقیقت کا ایک اور پیرایے میں اظہار ہے۔ اب گویا انھوں نے اس دعوے پر مُہر لگا دی کہ فارسی علم و زبان کے لحاظ سے میں علیٰ کلِ غالب ہوں۔

یہ تمام مُہریں خطِ نستعلیق یا خطِ نسخ میں ہیں۔ تحریر کی جگہ چھوڑ کر باقی مُہر میں بیل بوٹے ہیں۔ ہر ایک مُہر میں سنہ ضرور دیا گیا ہے۔ اس آخری دور میں دلّی میں بدرالدین علی خان بینظیر مُہر کن تھے۔ میرزا کے خطوں میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے اکثر مہریں یقیناً انہی کی تیار کردہ ہیں۔ مُہروں کا سائز عموماً ۱½ سم مربع ہے۔ خطاب والی مہر سب سے بڑی ہے، اس کا سائز "۲½ × ۲ سم" ہے۔ مُہروں کی شکل و صورت بھی دیدہ زیب اور دلکش ہے۔ میں نے اور کئی اشخاص اور بالخصوص خاندانِ لوہارو کے بعض اور افراد کی مہریں بھی دیکھی ہیں، اِلّاماشاءاللہ کسی میں حسن کے پہلو پر دھیان نہیں دیا گیا۔ دلکشی کا تو کیا ذکر، نام تک خوشخط نہیں لکھا ہے۔ یہ مُہریں میرزا کی نفاست پسند اور حسن پرست طبیعت پر بھی دال ہیں۔

القصہ میرزا کی یہ مہریں ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اور عام حالت کی مادّی ترجمان ہیں۔ یہ بات صرف ایک عظیم شخصیت ہی سے ممکن تھی کہ اس نے ان میں اپنی زندگی کے اہم واقعات کو بھر دیا۔ ورنہ مُہریں لوگ بنواتے نہیں تھے، یا اب نہیں بنواتے۔ اور میرزا تو خود کہہ گئے ہیں:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے، جو لفظ کہ غالب! مرے "گفتار" میں آوے

نواب شمس الدّین احمد خان

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے زمانے میں وسطِ ایشیا سے تین بھائی : قاسم جان، عالم جان اور عارف جان کچھ ساتھیوں سمیت تلاشِ روزگار میں ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔ جب یہ مختصر قافلہ اٹک پہنچا، تو یہاں کے صوبہ دار میرزا محمد بیگ نے سب سے چھوٹے بھائی میرزا عارف جان سے اپنی بیٹی بیاہ دی اور انھیں اپنے پاس ٹھہرالیا۔ لیکن جلد ہی یہ تینوں بھائی یہاں سے چل کر شاہ عالم ثانی کے عہد میں (۱۷۵۹-۱۸۰۶ء) دارالخلافے میں پہنچ گئے۔[1]

عارف جان کے چار بیٹے تھے : نبی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان (معروف)، اور محمد علی خان۔ ان میں سے احمد بخش خان نے ریاست گوالیار میں فوج کی نوکری اختیار کرلی۔ یہاں وہ سواروں میں ملازم تھے۔ حالت معقول تھی، نہ مفلس نہ تونگر۔ خوش اسلوبی سے دن گذر رہے تھے۔ لیکن خدا معلوم، کیا صورت پیش آئی کہ وہ ملازمت جاتی رہی۔ اس کے بعد وہ گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اسی سلسلے میں ایک گھوڑا لے کر اجمیر گئے۔ خیال تھا کہ عُرس کے موقعے پر گھوڑا اچھے داموں بک جائیگا۔ لیکن کوشش کے باوجود گھوڑا فروخت نہ ہوا۔ اس وقت ان کا ہاتھ بہت تنگ تھا، اور روپے کی سخت ضرورت تھی۔ خدا کی شان کہ ایک دن درگاہ میں پہنچ کے تضرع سے دعا کی؛ اس کے بعد گھوڑا منہ مانگی قیمت پر بک گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد یہ شاداں و فرحاں واپس دلّی آرہے تھے کہ راستے میں مہاراوَ راجا بختاور سنگھ والیِ الور سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے احمد بخش خان

۱- دیباچۂ دیوان معروف

کو اپنے ہاں ملازمت پیش کی۔ یہ بیکار تو تھے ہی، اس پیشکش کو بخوشی قبول کر کے مہاراجا کے ساتھ الور چلے گئے۔[2]

جب انگریزوں اور ریاست الور میں معاہدۂ رفاقت ہوا، تو مہاراجا نے انگریزوں کے ہاں اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے احمد بخش خان کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی حیثیت تقریباً وہی تھی، جو آج کل سفیروں کی ہوتی ہے۔ یہاں احمد بخش خان نے اپنے فرائض منصبی اس خوش اسلوبی سے سرانجام کیے کہ جہاں ایک طرف مہاراجا ان سے ہر طرح خوش اور مطمئن تھے، وہیں انگریز کو بھی ان کی معاملہ فہمی اور حزم و تدبر پر پورا اعتماد تھا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کی ریاست بھرت پور سے چھڑ گئی، اور انھوں نے ڈیگ کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ احمد بخش خان نے زور لگایا کہ مہاراجا الور اس موقع پر انگریزوں کا ساتھ دیں، اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ریاست الور نے سواروں کا ایک دستہ خود احمد بخش خان ہی کی کمان میں بطور کمک بھیج دیا، اور سامان رسد، خوراک وغیرہ سے بھی پوری مدد دی۔ لسواری کی جنگ میں انگریز سپہ سالار (فریزر) کے گولی لگی۔ قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے گر جائے کہ احمد بخش خان نے لپک کے اسے سنبھال لیا، اور اچھل کر اس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور لڑتے بھڑتے اسے دشمنوں کے نرغے سے نکال لائے۔ لیکن فریزر کا زخم ایسا کاری تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ البتہ مرنے سے پہلے اس نے اس حادثے کی مختصر رُوداد اور احمد بخش خان کی جانبازی کا حال ایک کاغذ پر لکھ کے ان کے حوالے کیا، جس میں انگریزی حکومت سے سفارش کی کہ ان کی خدمات کا مناسب اعتراف کیا جائے۔ یہ سند غالباً اب بھی ریاست لوہارو کے کاغذات میں موجود ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب فتح کا دربار منعقد ہوا، تو کمانڈر ان چیف، لارڈ لیک نے انھیں مفتوحہ علاقے میں سے جاگیر استمراری کے طور پر فیروز پور جھرکا، پوناہانا، بھچور، ساکرس، نگینہ وغیرہ کے اضلاع عطا کیے اور سند میں ان کا نام لکھوایا: فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ۔ مہاراجا بختاور سنگھ بھی دربار میں موجود تھے، اسی موقع پر لارڈ لیک نے انھیں بھی ۱۴ محال جاگیر میں عطا کیے تھے۔ مہاراجا نے خاموش رہنے میں اپنی ہیٹی خیال کی اور پرگنہ لوہارو جو ریاست الور کا

۲- "مرقع الور"، از منشی محمد مخدوم تھانوی۔

حصہ تھا) اپنی طرف سے احمد بخش خان کو مرحمت فرمایا؛ اور اس طرح اس کے بعد احمد بخش خان، نواب احمد بخش خان والیِ فیروز پور جھرکا و لوہارو ہو گئے۔

الور کے قیام کے زمانے میں نواب احمد بخش خان کے پاس ایک مقامی عورت مُدّی نام رہی تھی۔ اس کے بطن سے ان کے چار بچے ہوئے، دو لڑکے شمس الدّین احمد خان اور ابراہیم علی خان؛ اور دو لڑکیاں: نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم۔ بعد کو اسی نواب بیگم کا نکاح زین العابدین خان عارف سے ہوا تھا۔ جہانگیرہ بیگم ایک ایرانی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے شوہر کا نام محمد اعظم خان تھا۔ یہ لوگ آگرے میں رہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس خاندان کے نام لیوا اب بھی موجود ہوں۔

اب نواب احمد بخش خان نے ایک ہم کفو بیگم سے شادی کر لی۔ ان کا نام بیگم جان تھا اور یہ ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی تھیں۔ بعد کو لوہارو میں یہ خاندان "کپتان فیملی" کے نام سے مشہور رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیگم جان کے ایک بھائی، نذر محمد بیگ لوہارو کی فوج میں کپتان مقرر ہو گئے تھے۔ بیگم جان کا ۸ نومبر ۱۸۶۶ء کو انتقال ہوا۔[۳]

بیگم جان کے بطن سے نواب احمد بخش خان کے سات بچے ہوئے: امین الدّین احمد خان اور ضیاء الدّین احمد خان دو بیٹے اور منور جہان بیگم، ماہ رخ بیگم، بادشاہ بیگم، حاجی بیگم پانچ بیٹیاں۔

بظاہر شمس الدّین خان کے وارثِ ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ ان کی والدہ نواب احمد بخش خان کی بیاہتا بیوی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے خاندان کے چھوٹے بڑے، ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک، سب کے سب ان کے خلاف تھے، اور انھیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نواب احمد بخش خان نے انھیں گدّی کا وارث قرار دے دیا۔ اس کا ایک سبب تھا۔

مہاراجا بختاور سنگھ کے پاس ایک طوائف موسی نام تھی، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اس مُدّی کی بہن یا کم از کم قریبی رشتہ دار ضرور تھی، جو نواب احمد بخش خان کے گھر میں تھی۔

۳۔ اردوئے معلیٰ: ۲۸۹ (بنام نواب امین الدین احمد خان) بانیز فنانس (دہلی) مارچ ۱۸۶۶ء (۶۔۹) موجودہ قومی دفتر خانۂ سند، نئی دلی۔

موسی سے مہاراجا کے دو بچے ہوئے : ایک لڑکی، چاند بائی اور ایک لڑکا، بلونت سنگھ۔ مقامی رواج کے مطابق ایسی اولاد حقِ نجابت نہیں رکھتی اور خواص وال کہلاتی تھی۔ اس لیے بلونت سنگھ کے الور کی گدّی پر بیٹھنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ مُدّی کے اثر کے تحت یا کسی اور سبب سے نواب احمد بخش خان، بلونت سنگھ کے حامی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجا کے بھتیجے بنے سنگھ کے جتھے کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے انعام و اکرام کے وعدے پر ایک میو کو تیار کیا کہ وہ ان کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ ایک رات جب نواب دلّی میں اپنی ملکیّت نور باغ (واقع آزاد پور) میں اکیلے مقیم تھے، اس شقی نے ان پر سوتے میں حملہ کر دیا۔ بارے، وار اوچھا پڑا۔ جان تو بچ گئی، لیکن زخم بہت شدید آئے اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کٹ گئی۔[۴]

نواب احمد بخش خان نے مہاراجا بختاور سنگھ کو متاثر کرنے کے لیے ایک اور اقدام کیا۔ اوّلاً مُدّی کو بہو خانم کا لقب دے کر اپنی باقاعدہ بیوی تسلیم کر لیا اور پھر شمس الدین خان کو فیروز پور جھرکا کی گدّی پر بٹھلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لیے تاکہ کسی طرح الور کے لیے ایک مثال قائم ہو جائے اور وہاں بلونت سنگھ کا حق تسلیم ہو سکے۔ لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی؛ مہاراجا بختاور سنگھ کے بعد ان کا بھتیجا بنے سنگھ ہی الور کا حکمران بنا اور بلونت سنگھ نظر انداز کر دیا گیا۔

شمس الدین خان سے اپنے خاندان کی مخالفت، نواب احمد بخش خان سے مخفی نہیں تھی۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم علی خان صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب انھیں تشویش تھی، تو امین الدّین خان اور ضیاالدّین خان کی۔ کیونکہ گمانِ غالب تھا کہ خاندان کی مخالفانہ روش کا خمیازہ ان دونوں کو بھگتنا پڑیگا اور شمس الدین خان صاحبِ جاہ و مال ہو جائے کے بعد ان کی خبر تک نہیں پوچھیگا۔ اس لیے احمد بخش خان نے پیش بندی کے طور پر تقسیمِ وراثت کا انتظام اپنی زندگی میں مکمّل کر دیا، حال آں کہ اس سے پہلے ۲۳ اگست ۱۸۱۶ء کی وصیت کے مطابق انھوں نے تین مختاروں (نواب فیض اللہ بیگ خان، میرزا الٰہی بخش (معروف) اور لالہ گوردھن داس) کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ ان کی موت

۴- مرقع الور : ۱۲۸-۱۳۲

کے بعد جسے چاہیں، گدّی پر بٹھادیں۔[۵] لیکن اب انھوں نے اسے منسوخ کر کے ۱۸۲۲ء میں حکومتِ انگریزی اور دربارِ الور کی منظوری سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے بعد فیروز پور جھرکا کی گدّی پر شمس الدّین خان بیٹھے، اور لوہارو دوسری بیگم کے دونوں بیٹوں کے حصّے میں آئے۔ اس فیصلے کو پختہ کرنے کے لیے انھوں نے فروری ۱۸۲۵ء میں شمس الدّین خان سے بھی ایک دستاویز لکھوائی کہ میں بطیبِ خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا منظور کرتا ہوں، بشرطے کہ وہ ہمیشہ میری اطاعت کرتے رہیں؛ اور اس دستاویز پر جرنیل خرلونی اور سر چارلس مٹکاف کے دستخط بطورِ گواہ کرا لیے۔ مقدّم الذّکران ایام میں دلّی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس کا پورا اطمینان نہیں تھا کہ شمس الدّین خان اپنے دونوں بھائیوں کے حق میں انصاف کریگا۔ پورے سوچ بچار کے بعد اس اندیشے کا سدِّ باب انھوں نے یوں کیا کہ اکتوبر ۱۸۲۶ء میں وہ ریاست کے کاروبار سے خود بخود دست بردار ہو گئے اور اس تقسیم پر ان کی حینِ حیات ہی میں عملدرآمد شروع ہو گیا۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب شمس الدّین احمد خان ان کے وارث اور جانشین قرار پائے۔ انگریزوں کی طرف سے انھیں جانشینی کا خلعت، ۷ دسمبر ۱۸۲۷ء کو عطا ہوا تھا۔[۶] اس وقت شمس الدّین خان کی عمر ۱۷-۱۸ برس کے لگ بھگ تھی؛ امین الدّین خان ۱۳-۱۴ برس کے تھے اور ضیا الدین خان صرف چھ برس کے۔

والد کے جیتے جی نواب شمس الدّین خان نے جاداد کی اس تقسیم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی تھی۔ لیکن جونہی نواب احمد بخش خان کی آنکھیں بند ہوئیں، انھوں نے ان تمام اندیشوں کو درست ثابت کر دیا، جو اُس مرحوم کے دل میں تھے۔ اب انھوں نے سرکارِ انگریزی میں درخواست دی کہ خلفِ اکبر ہونے کی حیثیت سے نواب احمد بخش خان کی پوری ریاست (یعنی فیروز پور جھرکا اور لوہارو دونوں) بلا شرکتِ غیرے مجھے ملنا چاہیے۔ دوسری اولاد کو زیادہ سے زیادہ مقرّرہ گزارا دلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی دال نہ گلی۔

۵۔ [illegible] سی، ۵ ستمبر ۱۸۳۳ء (۹۲) (قومی دفتر خانۂ ہند)
۶۔ ایضاً

ان دنوں دلّی میں سر اڈورڈ کول بروک انگریزی ریذیڈنٹ تھا اور اسے تمام حالات معلوم تھے۔ اس نے صدر میں مخالفانہ رپوٹ کی، جس پر فیصلہ نواب صاحب کے خلاف ہو گیا۔ اتفاق سے اس کے جلد ہی بعد کول بروک ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر معزول کر دیا گیا اور اس کا جانشین فرانسس ہاکنس نواب کا گہرا دوست بن گیا۔ اس نے اس معاملے کو پھر اٹھایا اور نواب کے نظریّے کی تائید کی اور پہلا فیصلہ منسوخ کروا کے لوہارو بھی انھیں دلوا دیا۷

ہاکنس کی تبدیلی پر ۱۸۳۲ء میں سر ولیم فریزر ریذیڈنٹ ہو کر آئے۔ یہ اچھی خاصی عمر کے آدمی تھے اور اس سے پہلے بھی دلّی میں رہ چکے تھے۔ نواب احمد بخش خان کی زندگی میں ان کے آپس میں اتنے قریبی اور دوستانہ تعلقات رہے تھے کہ نواب صاحب کی اولاد انھیں اپنا بزرگ سمجھتی اور چچا کہہ کے خطاب کرتی تھی۔ وہ نواب مرحوم کی جاداد کی تقسیم کی تفصیلات اور اس سے متعلق ان کی کوششوں اور اندیشوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ جب یہ ریذیڈنٹ ہو کر آئے، تو قدرتی بات تھی کہ وہ نواب شمس الدّین خان کی کارروائیوں پر ناراضی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ انھوں نے خاندان سے اپنے پرانے تعلّقات کی بنا پر نواب شمس الدّین خان سے برملا کہا کہ تم نے اپنے دونوں بھائیوں کا حق غصب کر لیا ہے اور اس طرح نواب مرحوم کی وصیّت کی خلاف ورزی کی ہے۔ بلکہ انھوں نے زبانی سرزنش ہی پر اکتفا نہیں کی، صدر میں بھی لکھا کہ لوہارو پر نواب شمس الدّین خان کا کوئی حق نہیں ہے اور پہلا فیصلہ بحال کر کے لوہارو ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں — امین الدّین خان اور ضیاالدّین خان — کو واپس ملنا چاہیے۔ نہ صرف یہی، انھوں نے ۱۸۳۴ء میں امین الدّین خان کو کلکتے بھیجا کہ وہاں وہ اصالتاً عدالتِ عالیہ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کریں۔ چونکہ خاندان کے دوسرے افراد کی طرح غالب بھی نواب شمس الدّین خان کے خلاف تھے، اس لیے انھوں نے بھی اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام سفارشی خط لکھے۸ کہ وہ امین الدّین خان کی پوری مدد کریں۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوہارو دوبارہ ان دونوں بھائیوں کو مل گیا۔

۷۔ ذکرِ غالب: ۶۵

۸۔ کلیات نثر غالب: ۱۰۷

ولیم فریزر کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باعث نواب شمس الدّین خان اس سے سخت ناراض تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سینہ بسینہ جو روایات سننے میں آئی ہیں کہ ان دونوں کی مخالفت کی تہ میں کوئی "زن" تھی[9]، اگر وہ درست نہ بھی ہوں، تو بھی فقط یہی لوہارو کا قضیہ انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

جس وقت کلکتے سے اس تازہ فیصلے کی خبر موصول ہوئی، نواب شمس الدّین خان فیروزپور جھرکا میں مقیم اور کھانے پر بیٹھے تھے۔ جونہی انھیں یہ اطلاع ملی، انھوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اسی طرح مغموم وملول بیٹھے تھے کہ ایک منہ چڑھا مصاحب کریم خان نامی، جو اُن کا داروغۂ شکار بھی تھا، داخل ہوا۔ کریم خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زبردست نشانے باز تھا، اور اس کا بندوق کا نشانہ کبھی چوکتا ہی نہیں تھا۔ اسی باعث وہ "بھرمارُو" کے عرف سے مشہور تھا۔ اس نے جو نواب صاحب کو اس حالت میں دیکھا، تو پوچھا: خیر باشد، کیا معاملہ ہے؟ جب اسے معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی آزردگی کا سبب کیا ہے، تو ایک روایت کے بموجب اس نے خود بخود، اور دوسری کے مطابق خود نواب صاحب کی اشتعالک پر، فریزر کے قتل کا فیصلہ کرلیا؛ اور اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایک میواتی انیا نامی کو ساتھ لے کر دلّی کی طرف روانہ ہوگیا۔[10] وہ یہاں ۸ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو پہنچا تھا۔

کریم خان یہاں دلّی میں کم وبیش تین مہینے گھات میں لگا رہا۔ لیکن اس تمام مدّت میں اسے اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس دوران میں فریزر دلّی میں نہیں تھا؛ وہ یہ زمانہ زیادہ تر کرنال میں مقیم رہا۔ اور جب کبھی وہ دلّی آیا بھی، کریم خان کی اس سے اکیلے میں مڈبھیڑ نہ ہوسکی۔ آخر بیکار بیٹھے بیٹھے وہ تنگ آگیا اور دلّی سے روانہ ہوگیا۔ جب وہ ناکام فیروزپور واپس پہنچا، تو نواب صاحب بہت ناراض ہوئے اور اسے دوبارہ دلّی جانے کا حکم دیا کہ جس طرح بھی ہوسکے، فریزر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اب کے قسمت نے کریم خان کا ساتھ دیا۔

فریزر کی کوٹھی باڑہ ہندو راؤ میں تھی۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء شام کا کھانا اس نے راجا کشن گڈھ

۹۔ مثلاً دیکھیے، کارنامۂ سروری: ۶۴-۶۵؛ واقعات دار الحکومت دہلی، ۲: ۴۹۲

۱۰۔ غالب (مہر): ۴۷

کے ساتھ ان کے مکان واقع دریا گنج میں کھایا۔ نواب شمس الدین خان کی ایک کوٹھی دریا گنج میں بھی تھی اور کریم خان پہلی مرتبہ ٹھہرا بھی وہیں تھا۔ اگرچہ اب کی مرتبہ وہ نواب صاحب کے دوسرے مکان واقعہ بلی ماران میں اترا تھا، لیکن وہ دریا گنج والے مکان پر اکثر آتا جاتا رہتا تھا، جہاں کے سب ملازم اسے جانتے اور اس کے دوست تھے۔ قدرتی طور پر اسے بھی فریزر کی نقل و حرکت کا پتا چل گیا۔ جونہی کافی رات گئے، نشے میں سرشار، فریزر دریا گنج سے باڑہ ہندو راؤ واپس جانے کے لیے روانہ ہوا، کریم خان بھی گھوڑے پر سوار اس کے پیچھے لگ گیا۔ آخر کار اس نے انھیں پہاڑی کے قریب جا لیا اور ان پر بندوق سے فیر کر دیا۔ اس نے تین فیر کیے، گولی پشت کی طرف سے چلائی تھی۔ ایک گولی دہنے شانے کے قریب لگی اور جسم کے پار ہو گئی۔ دو گولیاں جسم کی بائیں طرف اندر ہی رہ گئیں۔

اگر کریم خان اسی وقت گھوڑے کی باگیں شہر سے باہر کی طرف موڑ کے نکل جاتا، تو ممکن تھا کہ وہ نلوہ بچ جاتا اور قاتل کا کبھی کوئی سراغ ہی نہ ملتا۔ لیکن غالباً اسے یقین نہیں تھا کہ فریزر اس کی گولی سے واقعی ہلاک ہو گیا ہے، لہٰذا راہِ فرار اختیار کرنے کی بجائے وہ واپس دریا گنج آ گیا۔ ادھر چونکہ گولی فریزر کے مکان کے بالکل قریب چلی تھی، اس لیے نہ صرف اس کے ساتھ کے اسوار ہی، جو اس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے سے آ رہے تھے، بلکہ اس کے مکان کے پہرے کے سپاہی بھی معاً موقعے پر آ پہنچے۔ فریزر گولی لگتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ سپاہی لاش اٹھا کے اندر لے گئے۔ مقتول کے بھائی سائمن فریزر شہر کے مجسٹریٹ تھے؛ انھیں اطلاع دی گئی۔ وہ بھی فوراً آ گئے۔ چونکہ قاتل شہر میں داخل ہوتا دیکھ لیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے حکم دیا کہ بلا توقف شہر کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور کوئی شخص باہر نہ جانے پائے، اور تحقیقات کی جائے۔!!

کریم خان نے مکان پر پہنچتے ہی فوراً اپنے ساتھی انیا کو فیروز پور جھرکا بھیج دیا کہ نواب صاحب کو کارگزاری کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ ناکے بند ہونے سے پہلے وہ شہر سے نکل گیا۔

۱۱۔ کرنیل سلیمان کی انگریزی کتاب Recollections and Rambles of an Indian Official
Col. S.W. Sleeman باب ۱۶؛ نیز دیکھیے واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی، ۲: ۲۹۲-۲۹۳

انیا سے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین اور تیز ترین دوڑنے والوں میں سے تھا۔ اس نے چوبیس گھنٹوں میں اسّی نوّے میل کی مسافت طے کر کے اگلے دن شام کے وقت ساری رُوداد نواب صاحب کے گوش گزار کر دی۔

اس کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ہر قدم پر تفتیش کرنے والوں کو کامیابی ہوتی گئی۔ غالب نے ایک فارسی خط میں لکھا ہے[۱۲] کہ چونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ میرے اور نواب شمس الدین خان کے تعلقات آپس میں کشیدہ ہیں، اس لیے انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ میں نے اس معاملے میں نواب صاحب کے خلاف مخبری کی ہے، حالانکہ یہ سارا کیا دھرا خود نواب صاحب کے ابنِ عم فتح اللہ بیگ خان کا ہے اور میں اس معاملے میں بالکل بقصور ہوں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ خود نواب شمس الدین خان کو بھی فتح اللہ بیگ خان کے خلاف شکایت تھی۔ لیکن اگر یہ درست نہ بھی ہو، تو بھی ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود تھیں:

(۱) یہ کسی سے مخفی نہیں تھا کہ لوہارو کے قضیے میں فریزر نے جس سرگرمی سے نواب صاحب کے خلاف کام کیا ہے، اس سے نواب صاحب بہت برافروختہ ہیں۔

(۲) اسی شبہے کی بنا پر نواب صاحب کی دریا گنج والی کوٹھی کی تلاشی ہوئی اور وہاں سے نواب صاحب کے کریم خان کے نام لکھے ہوئے بعض خطوط، اور دوسرے کاغذ، برآمد ہوئے جن سے معاملہ اور مشتبہ ہو گیا۔

(۳) جب کریم خان سے اُس کی نقل و حرکت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی، تو اس کے جواب ناتسلی بخش پائے گئے۔ اس پر اسے زیرِ حراست لے لیا گیا۔

(۴) قتل کے دو تین دن بعد دریا گنج کے علاقے میں ایک شخص کا ڈول کنوئیں میں گر گیا۔ جب غوطہ خور کنوئیں میں اترا، تو ڈول کے علاوہ اس میں سے ایک بندوق بھی نکلی، جس کی نال کٹی ہوئی تھی۔ ایک لوہار نے اسے شناخت کیا اور کہا کہ یہ بندوق کریم خان کی ہے، اور خود میں نے اس کے کہنے پر اس کی نال کاٹی تھی۔ مزید برآں غائر معائنہ کرنے پر ثابت ہو گیا کہ جس

۱۲۔ کلیاتِ نثر: ۱۹۲؛ نیز ذکرِ غالب: ۸۱-۸۳

گولی سے فریزر ہلاک ہوا تھا، وہ اسی بندوق سے چلی تھی۔

(۵) نواب شمس الدین خان کو جب قتل کے حادثے سے پہلے بہت دن تک دلّی سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، تو انھوں نے کریم خان کے بہنوئی واصل خان کو صورتِ حال دریافت کرنے کے لیے دلّی روانہ کیا تھا۔ وہ اتفاق سے قتل کے اگلے ہی دن یہاں پہنچا اور گرفتار ہو گیا۔

غرض کریم خان اور واصل خان کے جوابات سے مجسٹریٹ کا اطمینان نہ ہوا، اور اس کے دل میں شبہہ گزرا کہ اس قتل میں خود نواب صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ اس پر انھیں دلّی آنے کے لیے لکھا گیا۔ بعض لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ انگریز کو کوئی اعتبار نہیں، آپ دلّی نہ جائیں اور اپنی جان بچا کر کسی طرف کو نکل جائیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور دلّی چلے آئے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ گرفتار کر لیے گئے۔

مقدمہ چلا۔ اوّلاً اس کی سماعت سائمن فریزر کی عدالت میں ہوئی۔ بعد کو حکومت نے مسٹر کالون اسپیشل کمشنر کو خاص طور پر اس مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کر دیا۔ شروع میں نواب شمس الدین خان کے خسر میرزا مغل بیگ خان کو بھی کریم خان کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا، چونکہ ان کا مکان بلی ماران میں اس جگہ کے پڑوس میں تھا، جہاں کریم خان ٹھہرا تھا۔ لیکن جب ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا، تو بعد کو وہ رہا کر دیے گئے۔ انیا، جو اس اثنا میں گرفتار ہو چکا تھا، سلطانی گواہ بن گیا اور اس نے سارا راز طشت از بام کر دیا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ واقعی قتل کریم خان نے کیا ہے۔ چنانچہ اسے ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دے دی گئی۔ موقع پر چار سو پیادہ فوج موجود تھی۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ کریم خان بیگناہ ہے۔ انھوں نے اس کی سرخ و سپید رنگت کی مناسبت سے اسے "گل سرخ" کا خطاب دیا تھا۔ کریم خان نے وصیّت کی تھی کہ مسلمان میری مغفرت کے لیے دعا کریں۔ چنانچہ جس دن اسے پھانسی ہوئی ہے، اس دن دلّی کی مسجدوں میں اس کے لیے دعا مانگی گئی۔ مدّتوں لوگ اس کی قبر پر پھول چڑھاتے اور چراغاں کرتے رہے۔ قوّال وہاں قوّالی گاتے اور رقص کرتے[۱۳]۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی قبر کہاں تھی!

۱۳۔ تاریخ صحافت اردو، ۱: ۸۵-۸۷۔

نواب صاحب سے متعلق کالون کا یہ فیصلہ تھا کہ قتل ان کی انگیخت اور شہ پر ہوا ہے۔ لہذا وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہیں، جو اصلی قاتل کو دی گئی ہے۔ لیکن چونکہ نواب صاحب ایک ریاست کے حکمران تھے، وہ خود انھیں سزا دینے کا مجاز نہیں تھا۔ لہذ کالون نے مقدّمے کے سارے کوائف، تفتیش کے نتائج، اپنی رائے وغیرہ لکھ کے حکم صادر کرنے کے لیے کلکتے بھیج دی۔[۱۴] نواب صاحب کو جب اس کا علم ہوا، تو انھوں نے اپنے وکیل مرزا اسفندیار بیگ[۱۵] کو مقدّمے کی پیروی کے لیے کلکتے روانہ کیا۔ اسفندیار بیگ نے وہاں ایک انگریز وکیل چارلس تھیکرے کی معرفت کارروائی کی، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخری حکم یہی صادر ہوا کہ نواب شمس الدّین خان کو بھی پھانسی دے دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں نواب صاحب کو جمعرات کے دن ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء صبح کے وقت کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ موقع پر دیسی اور گورہ فوج کا کافی انتظام تھا کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں شہر میں فساد نہ ہو جائے یا لوگ عین موقع پر نواب صاحب کو بچانے اور رہا کرانے کی کوشش نہ کریں۔ نواب شمس الدّین خان سے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ بیگناہ ہیں۔ اتفاق سے جب نعش لٹک رہی تھی، تو اپنے آپ قبلہ رُخ ہو گئی۔ اس سے بھی لوگوں نے یہی اثر لیا کہ وہ بیگناہ شہید ہوئے ہیں۔ لاش ایک گھنٹے تک لٹکتی رہی۔ اس کے بعد اسے نواب مرحوم کے خسر میرزا مغل بیگ خان کے سپرد کر دیا گیا۔ نمازِ جنازہ آٹھ ہزار کے مجمع کے ساتھ دلّی کے مشہور عالم حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق نے پڑھائی۔[۱۶] قدم شریف میں دفن ہوئے۔

۱۴۔ پی سی۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء (۳۲)

۱۵۔ مرزا اسفندیار بیگ کا نام غالب کے اردو اور فارسی خطوں میں کئی جگہ آیا ہے۔ وہ بریلی کا رہنے والا تھا۔ پہلے ضلع مظفر نگر میں نیابتِ فوجداری پر متمکّن رہا۔ وہاں سے نواب شمس الدّین خان کے پاس منصرم اور مختار کار ہو کے آ گیا۔ جب اس مقدمے میں اسے ناکامی ہوئی، تو اظہارِ رنج و غم میں اس نے دستار باندھنا ترک کر دی، اور اس کے بعد ساری عمر سر پر ایک مختصر سادو پٹا پیٹتا رہا۔ جب وہ الور میں منشی اتو خان کے زمانے میں نائب دیوان ہو گیا، اور بعد کو ان کے وہاں سے نکلنے پر خود دیوان بن گیا، تو بھی ہمیشہ اسی وضع میں رہا۔ اسی باعث وہ الور میں "مرزا بھینٹے باز" کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۸۹۲ء میں فوت ہوا۔ (مرقع الور: ۱۴۴-۱۵۲؛ اردوئے معلّیٰ ۱:۲۱۲)

۱۶۔ تاریخ صحافتِ اردو، ۱: ۸۸-۸۹؛ ذکرِ غالب: ۸۳

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے:
بعض لوگوں نے نواب شمس الدین خان کی پھانسی کی تاریخ ۲ اکتوبر ۱۸۳۵ء لکھی ہے۔ یہ غلط ہے۔ تمام سرکاری دستاویزوں میں یہ ۸ اکتوبر دی گئی ہے۔ اتفاق سے ایک اور ہمعصر شہادت بھی مہیا ہوئی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں ایک مجموعے[۱۷] میں، "بارد الاشرار" کا قلمی نسخہ ہے، یہ کسی فتح اللہ کا کلام ہے۔ اس کا ترقیمہ ہے:

تمام باشد بعون الہی بتاریخ ۱۴ یوم پنجشنبہ سنہ ۱۲۵۱ھ جمید الثانی دہم دریں روز تاریخ و ماہ و سنہ نواب شمس الدین خان جنت رسید شد یعنی بہ تہمت خون فرزند انگریزاں سولی دادند و بر دار کشیدند۔

محمد مظفر خان گرم رامپوری (شاگرد ذوق) نے تاریخ وفات ایک معمے کی شکل میں لکھی۔ فرماتے ہیں:

یہ دست درازیِ ستم کس سے بیاں ہو
بے جرم و گنہ مسندِ نواب کو الٹا
تاریخ معمے میں نئی طرز سے لکھ، گرم!
کیا چرخ نے "نوابی سہراب" کو الٹا

تاریخ "نوابی سہراب" کے لفظوں کو الٹنے سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۵۲ھ لیکن اس میں ایک زیادہ ہے، صحیح ۱۲۵۱ھ ہوگا۔ ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کی تاریخ مطابق تھی، ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ کے۔ ایک عدد کی کمی بیشی شعرا نے بعض اوقات جائز رکھی ہے[۱۸]!

نواب شمس الدین خان کا پہلا نکاح میرزا مغل بیگ خان کی صاحبزادی افضل النسا بیگم، (عرف جانی بیگم) سے یوم الجمعہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ (۱۱ جولائی ۱۸۲۸ء) کو ڈھائی لاکھ روپے مہر پر ہوا تھا۔ اس کے نو مہینے بعد انھوں نے شب ۱۹ شوال ۱۲۴۴ھ (۲۴ اپریل ۱۸۲۹ء) کو دوسرا نکاح حسینی بیگم (بنت ولی محمد) سے کیا، اس میں مہر ۱۲۵ سونے کی اشرفیاں مقرر ہوا تھا، جس کا ایک تہائی عند الطلب (معجّل) تھا اور بقیہ دو تہائی مؤجل۔ اس دوسری

۱۷۔ فہرست انڈیا آفس لائبریری (ک 116. م)
۱۸۔ مکاتیب غالب: ۱۲۴ (حواشی)

بیگم کو بعد کو امیر بہو خطاب ملا تھا[۱۹]
افضل النسا بیگم سے نواب شمس الدین خان کی دو بیٹیاں ۔ احمد النسا بیگم اور شمس النسا بیگم ہوئیں؛ امیر بہو سے کوئی اولاد نہیں ہوئی[۲۰]
ان دو بیاہتا بیویوں کے علاوہ ان کی دو داشتائیں بھی تھیں: (۱) چمپا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی رحمت النسا ہوئی تھی[۲۱] (۲) وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم (دختر محمد یوسف سادہ کار) اس سے ان کے ایک لڑکا نواب مرزا ہوا، جو آگے چل کر ہماری زبان کا مشہور شاعر داغ دہلوی کہلایا[۲۲]
نواب احمد بخش خان نے ۱۸۲۵ء کے اواخر میں ڈھائی لاکھ روپیہ بطور قرض پانچ فی صد سود پر پانچ برس کے لیے انگریزی حکومت کو دیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۲۶ء میں جب وہ ریاست سے دست بردار ہوئے، اور اپنی جگہ شمس الدین خان کو گدی پر بٹھا دیا، تو انھوں نے یہ رقم بھی بیٹے کے نام منتقل کر دی[۲۳] نواب شمس الدین خان نے افضل النسا بیگم سے نکاح کے بعد ۷ نومبر ۱۸۲۹ء کو یہ پرامیسری نوٹ مہر کے عوض میں اپنی بیوی کو دے دیا۔ اس کے بعد اس کا سود بھی انھیں بیگم کو ملا[۲۴]
جب نواب شمس الدین خان کو پھانسی ہوئی، تو انگریزوں نے نہ صرف ریاست فیروز پور جھرکا واپس لے لی، جو انھی نے نواب احمد بخش خان کو دی تھی، بلکہ نواب مرحوم کی تمام جائداد بھی بحقِ سرکار ضبط ہو کر نیلام کر دی گئی۔ لیکن جائداد کی نیلامی سے جو رقم وصول ہوئی، وہ نواب مرحوم کے

۱۹۔ پی سی، یکم مئی ۱۸۳۷ء (۴۵) (مخزونہ قومی دفتر خانۂ ہند)
۲۰۔ پی سی، ۱۶ مئی ۱۸۳۶ء (۱۷۔۱۸)
۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ داغ کے کسی سوانح نگار نے نواب شمس الدین خان اور چھوٹی بیگم کے نکاح کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ سب نے داغ کی ولدیت کی صراحت ضرور کی ہے۔ نساخ نے سرے سے باپ کا نام ہی نہیں لیا؛ اور لکھ دیا: ولد چھوٹی بیگم (سخن شعرا: ۱۵۷)
۲۳۔ پی سی ۵ ستمبر ۱۸۳۳ (۹۲)
۲۴۔ پی سی، ۷ اپریل ۱۸۴۸ء (۲۰۳)

مواجبات کی ادائی کے لیے بالکل ناکافی تھی ؛ کوئی چار لاکھ کی کمی تھی ۔ مقامی حکام چاہتے تھے کہ پرامیسری نوٹ کی ڈھائی لاکھ کی رقم بھی نواب مرحوم کی جاداد میں شامل کر لی جائے، تاکہ اسے ان کے قرض اور دوسرے مطالبات کے صاف کرنے میں صرف کیا جاسکے ۔ اس پر افضل النسا بیگم نے جائز طور پر دعویٰ کیا کہ یہ ان کا دینِ مہر ہے، جو نواب صاحب اپنی زندگی میں انھیں ادا کر چکے تھے، لہٰذا اب یہ رقم کسی طرح سے ان کے ترکے میں محسوب نہیں ہو سکتی ۔ بہت ردوکد کے بعد کہیں تین سال میں ان کا یہ دعویٰ تسلیم کیا گیا، اور ۲۱ جون ۱۸۴۰ء کو یہ رقم انھیں ادا ہوئی[۲۵]

افضل النسا بیگم اور نواب مرحوم کی والدہ بہو بیگم نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر کوئی قصور تھا، تو نواب مرحوم کا اور اس کی سزا انھیں مل گئی ؛ لیکن اس کے لیے ان کی اولاد اور دوسرے پسماندگان کو کیونکر ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے، جو انھیں اپنے حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے ؛ ریاست ان پر بحال ہونا چاہیے، جو نواب احمد بخش خان کو دائماً نسلاً بعد نسلٍ عطا ہوئی تھی ۔ لیکن بےسود، حکومت نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا[۲۶]

۲۵- ایضاً

۲۶- پی سی ۳۱۰، مارچ ۱۸۳۶ء (۷-۹)؛
نیز پی سی، ۵، فروری ۱۸۳۶ (۹۹)

مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ

میں نے جب اپنی کتاب "ذکرِ غالب" کا چوتھا ایڈیشن، مرتب کیا، تو اس پر نظرِ ثانی کرتے وقت وہ تمام مواد میرے پیشِ نظر تھا، جو غالب کے پنشن کے مقدمے سے متعلق قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دلّی میں موجود ہے۔ میں نے اس ایڈیشن میں اس قضیئے سے متعلق پوری تفصیلات لکھ دی تھیں۔ لیکن دلّی کے کاغذات میں مجھے غالب کی سب سے پہلی درخواست نہیں ملی تھی، جو انھوں نے کلکتے میں گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی۔ دفتر خانے کی فہرست میں بھی کہیں کوئی نشاندہی نہیں کہ یہ کیا ہوئی۔ بہرحال چونکہ میرزا نے اپنی بعد کی متعدد درخواستوں میں اس کے مضامین کا بار بار اعادہ کیا ہے، اس کی عدم موجودگی سے مقدمے کی کوئی تفصیل تشنہ نہیں رہ گئی۔

چند برس ہوئے، مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ انڈیا آفس لائبریری گیا، تو وہاں میں نے غالب سے متعلق تمام کاغذات نکلوائے۔ انھیں میں یہ گمشدہ درخواست بھی مل گئی۔ اس سے مقدمے کے بارے میں تو کوئی نئی بات نہ ملی، لیکن اس کی تمہید میں (اور کہیں کہیں درمیان میں بھی) انھوں نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے ان کی زندگی کے بعض نئے حالات کا انکشاف ہوا، اور بعض معلومہ حالات کی تصدیق یا توضیح ہوئی۔ انہی کا بیان یہاں مقصود ہے۔

اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ لوگ اپنی درخواستیں فارسی میں لکھتے، اور گورنر جنرل کے دفتر کا فارسی محکمہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کرکے کونسل کے پیش کر دیتا تھا۔ یقیناً غالب نے بھی اپنی درخواست فارسی ہی میں لکھی ہوگی اور دفترِ متعلقہ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اب میں اس انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ میں یہاں متن میں اصلی درخواست کے اقتباس پیش کرونگا۔ یہ ضروری نہیں کہ اس درخواست کی معلومات سب نئی ہی ہوں، بلکہ اس میں قدرتی

طور پر شائع شدۃ ذکرِ غالب کی بعض معلومات کا اعادہ بھی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ربط قائم رہے۔ دہو ہٰذا۔

(۱) اس درخواست کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے[۱]۔

(۲) جب فوج کی کمان پیرون (Perron) کے ہاتھ میں تھی تو اس کی طرف سے میرے چچا نصر اللہ بیگ خان آگرے کے قلعدار مقرر ہوئے۔ پھر جب انگریزی فوج نے اس علاقے میں پیشقدمی کی، تو نصر اللہ بیگ خان نے ہتھیار ڈال دیے، اور انگریزی حکومت سے مل گئے[۲]۔ اس کے بعد جب انھوں نے لارڈ لیک سے ملاقات کی، تو موصوف نے بھی قلعے کا نظم ونسق عارضی طور پر انہی سے متعلق رکھا۔ پھر جب مسٹر ولیر (Villier) کمشنر اور قلعدار مقرر ہوئے، تو صوبے کا صدر مقام بدل گیا۔ اس پر نصر اللہ بیگ خان متھرا میں لارڈ لیک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں چار سو سواروں کے دستے کی کمان ان کے تفویض ہوئی اور سترہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی[۳]۔

(۳) جب راجا بھرت پور سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے، اور لارڈ لیک کی ولایت کو واپسی کا فیصلہ ہوا، تو روانگی سے پہلے انھوں نے ان کی وفاداری اور خدمات کے اعتراف میں نصر اللہ بیگ خان کو صوبۂ آگرہ میں سونک اور سونسا کے دو پرگنے حینِ حیات مقرری جاگیر میں عطا کیے[۴]۔ ان کی جمع معافی پندرہ ہزار آٹھ سو (۱۵،۸۰۰) سالانہ مقرر ہوئی۔ ان دونوں پرگنوں کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی[۵]۔

اس چار سو سواروں کے دستے کی کمان اور سترہ سو کے مشاہرے اور جاگیر سے ان کی طاقت اور اثر درسوخ میں بہت اضافہ ہو گیا۔

۱۔ میرزا دلی سے ۲۱ جنوری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے (ذکر غالب: ۴۲)۔ گویا انھوں نے حالات کا جائزہ لے کر تقریباً دو مہینے بعد اپنی درخواست پیش کر دی۔

۲۔ ذکر غالب: ۳۰

۳۔ میرزا نے حبیب اللہ ذکا کو لکھا تھا (اردوے معلیٰ: ۲۶) کہ "تنخواہ سترہ سو مقرر ہوئی"۔ معلوم ہوا کہ یہ ماہانہ تھی (نیز دیکھیے ذکر غالب: ۳۰)

۴۔ اس جاگیر کے پروانے کی تاریخ ۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء ہے۔

۵۔ ذکر غالب: ۳۰ ؛ نیز اردوے معلیٰ: ۲۶ (بنام ذکا)

(۴) لارڈ لیک کی اصلی دستخطی سند (اور اس کی کرنیل براؤن کی مصدقہ نقل) اور لارڈ موصوف کا دستخطی پروانہ جو انھوں نے نصراللہ بیگ خان کو عطا کیے تھے، میرے پاس موجود ہیں اور ان کی نقول میں اس درخواست کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

(۵) یہ جاگیر ملنے کے دس گیارہ مہینے بعد نصراللہ بیگ خان جب کہ وہ باہر سیر کے لیے گئے ہوئے تھے، اچانک ہاتھی پر سے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور بھی سخت چوٹیں آئیں۔ چند دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[۶] اس پر جاگیر حکومت نے واپس لے لی اور اسواروں کے رسالے کو منتشر کر دیا۔

(۶) نصراللہ بیگ خان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وفات کے وقت ان کے ورثا حسب ذیل تھے:

(۱) میں؛ (۲) میرا چھوٹا بھائی؛ (۳) میری دادی، یعنی نصراللہ بیگ خان کی والدہ؛

(۴) نصراللہ بیگ خان کی تین بہنیں۔ اس وقت میری عمر نو برس کی تھی، اور میرے بھائی کی سات کی؛ میری دادی ستّر برس کو پہنچ چکی تھیں۔

(۷) اس حادثے کے وقت خاندان میں یا عورتیں تھیں، یا ہم دونوں کمسن بچے۔ اس لیے ہم میں سے کوئی بھی ان کے مال اسباب کو جمع کرنے کی کوشش نہ کر سکا۔ ایک شخص خواجہ حاجی نامی نے (اس کا ذکر آگے آتا ہے) جو اُن کا ملازم تھا، میدان خالی دیکھ کر مرحوم کے کیمپ کے تمام ساز و سامان، مال اسباب، خیموں، چھولداریوں، اونٹوں، پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ستّر اسّی اسواروں اور ایک ہاتھی کو ساتھ لیے، جا کے نواب احمد بخش خان سے مل گیا؛

(۸) چونکہ خواجہ حاجی اسواروں، ہاتھی اور ساز و سامان کے ساتھ ان سے آ ملے تھے، نواب احمد بخش خان نے انھیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لیا، جسے وہ بہرحال پہلے سے اپنے بہنوئی کے ملازم کی حیثیت سے جانتے تھے۔

(۹) کچھ دن بعد نواب احمد بخش خان نے اعلان کیا کہ حکومتِ انگریزی نے نصراللہ بیگ خان کے پسماندگان کے گزارے کے لیے پانچ ہزار سالانہ کا وظیفہ بتفصیلِ ذیل مقرر کیا ہے اور یہ

۶- احوال غالب: ۲۸؛ مکاتیب غالب: ۸ وغیرہ

۷- یہاں انگریزی عبارت میں نصراللہ بیگ خان کو نواب احمد بخش خان کا داماد لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمے کی غلطی ہے، نصراللہ بیگ خان ان کے داماد نہیں، بلکہ بہنوئی تھے اور ان کی بیوی ان سے پہلے لاولد فوت ہو چکی تھیں۔ یہ اس دستاویز میں بھی لکھا ہے۔

رقم ان کی جاگیر (فیروز پور جھرکا) کے خزانے سے ادا کی جائیگی:

خواجہ حاجی	:	۲,۰۰۰ روپیہ
والدہ نصراللہ بیگ خان	:	۱,۵۰۰ "
درخواست کنندہ (یعنی غالب)	:	۱,۵۰۰ "

(۱۰) جب میں بالغ ہوا، اور مجھے بھلے برے اور نیکی بدی کی تمیز آئی، تو میں نے محسوس کیا کہ نواب احمد بخش خان نے وظیفے کی تقسیم میں دو غلطیاں کی ہیں:

اول۔ انھوں نے مرحوم کے پسماندگان میں ایک اجنبی ملازم[9] کو شامل کرلیا ہے۔

دوم۔ انھوں نے میرے چھوٹے بھائی کو جو میری ہی طرح نصراللہ بیگ خان مرحوم کا سگا بھتیجا تھا، بالکل نظرانداز کردیا ہے[10]۔

مزید مجھے بالخصوص اس بات پر غیر معمولی تعجب ہوا کہ لارڈ لیک کا سا دریادل اور کریم النفس شخص، جس نے لوگوں کو لاکھوں کے عطیے دیے، وہ صرف پانچ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کرے ایک ایسے شخص کے ورثا کے لیے، جس کی جاگیر کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

(۱۱) میں نے بارہا نواب احمد بخش خان سے زبانی اور تحریری احتجاج کیا کہ خواجہ حاجی کو اس وظیفے میں کیوں حصہ دار بنادیا گیا ہے۔ وہ کہتے رہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں جرنیل صاحب (لارڈ لیک) کے سامنے اسے نصراللہ بیگ خان کا رشتہ دار کہہ چکا ہوں۔ اگر اب میں کچھ اس کے خلاف کہوں، تو یہ میری بےعزتی کا باعث ہوگا۔ چندے اور صبر کرو۔ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد میں اس کے دو ہزار بھی تم دونوں بھائیوں کو دے دونگا۔ احمد بخش خان میرے بزرگ اور ہمقوم تھے اور ان کی مجھ سے دوہری دوہری عزیزداری تھی۔ یعنی میرے چچا ان کے بہنوئی تھے اور خود میں ان کے بھائی الٰہی بخش خان کا داماد تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا اور میں نے اپنے بھائی کو بھی منع کردیا کہ نواب صاحب کے خلاف حکومتِ انگریزی سے کوئی شکایت نہ کی جائے۔

۸۔ یہ ٹھیک نہیں۔ چونکہ وظائف کی تفصیلی تقسیم ۷ جون ۱۸۰۶ء کے خط پر مبنی تھی، اور اس درخواست کے وقت تک غالب کو اس کا علم ہی نہیں تھا، اس لیے وہ ناموں اور رقوم کا ٹھیک ٹھیک تعیّن نہ کرسکے۔

۹۔ اس سے خواجہ حاجی مراد ہے۔

۱۰۔ یہ ٹھیک نہیں؛ پندرہ سو سالانہ انھوں نے دونوں بھائیوں کے لیے دیا تھا۔

(۱۲) ایک زمانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب کے سال ہمیں پوری تنخواہ ملیگی۔ لیکن جب وظیفہ تقسیم ہوا، تو دو ہزار کی مشارٌ الیہ رقم خواجہ حاجی کے دونوں بیٹوں کو ادا کر دی گئی۔

(۱۳) میں مایوسی کے عالم میں نواب احمد بخش خان کے پاس فیروزپور حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو ان کا حق دینا چاہیے، یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کے اپنا مطالبہ حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کروں۔
اس سے تھوڑے دن پہلے نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار تھے۔ انہی ایام میں وہ بسترِ علالت سے اٹھے تھے۔ مزید برآں ان کی الور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی، جس سے وہ بہت افسردہ اور غمگین تھے۔ وہ میرے سامنے رونے بلکہ ہچکیاں لینے لگے فرمایا:

> تم میرے بچے اور نورِ نظر ہو۔ دیکھتے ہو کہ مجھے کیسے زخم آئے ہیں، اور کیسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا حق مارا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر افسوسناک امر یہ ہے کہ جرنیل اختر لونی[۱۱] کی اور میری دوستی ختم ہو گئی۔ کچھ اور تحمل سے کام لو۔ تمہارا حق تمہیں پورا پورا ملیگا۔

اس کے جلد بعد ہی اختر لونی کا انتقال ہو گیا اور پھر ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی خبر موصول ہوئی۔
نواب صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ سر چارلس مٹکاف کو آنے دو میں تمہیں ان کی خدمت میں پیش کر کے تمہارا ان سے تعارف کرا دونگا اور تمہارے معاملات اور تمہارے چچا کے سرکارِ انگریزی سے تعلقات تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دونگا تا کہ حقدار کو اس کا حق مل سکے۔
نہ صرف یہ، بلکہ میں حکومت سے کہہ کر تم پانچوں[۱۲] کے نام الگ الگ سندلے دونگا، تا کہ میرے بعد میری اولاد روپیہ دینے میں کوئی عذر اور رکاوٹ نہ پیدا کر سکے اور تمہیں باقاعدہ گزارا ملتا رہے۔

۱۱- جرنیل اختر لونی ان دنوں دلّی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھا۔ اس کا انتقال ۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء کو میرٹھ میں ہوا۔

۱۲- اس سے معلوم ہوا کہ اس درخواست (۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء) سے پہلے غالب کی دادی (یعنی نصر اللہ بیگ خان کی والدہ) کا انتقال ہو چکا تھا۔

سر چارلس مٹکاف کے آنے کے بعد بھرتپور کا معاملہ[13] پیش آگیا اور وہ راجا بھرتپور کو بچانے اور راج کے شورہ پشتوں کو سزا دینے میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ نواب احمد بخش خان بھی وہاں جا رہے تھے، انھوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی بیماری[14] کی وجہ سے ایک مصیبت میں گرفتار تھا۔ مزید برآں قرضخواہوں نے تقاضوں سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لیے میں اس سفر کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود، اس توقع پر کہ مجھے مٹکاف صاحب کی خدمت میں سلام کرنے کا موقع مل جائیگا، میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑا اور چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا، کچھ قرضخواہوں کو طرح طرح کے وعدوں سے چپ کرایا، دوسروں کی نظر سے چوری چھپے، بھیس بدل کر، کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر، سر مشکلوں سے میں نواب احمد بخش خان کے ساتھ بھرتپور کے لیے روانہ ہو گیا۔

میرے بار بار کے کہنے کے باوجود نواب احمد بخش خان نے سر چارلس سے میرا تعارف نہ کرایا! اس اثنا میں نواب صاحب کے منہ پر لقوہ ہو گیا۔ کچھ مدت بعد ڈاکٹر ڈنکن (Duncan) کے علاج سے وہ ٹھیک ہو گئے اور فیروزپور واپس چلے آئے۔ حالانکہ سر چارلس مٹکاف بھی تین دن وہاں فیروزپور میں رہے، اور میں بھی روزانہ نواب احمد بخش خان سے درخواست کرتا رہا، انھوں نے مجھے سر چارلس کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔

جب مٹکاف صاحب بہادر دلی واپس چلے گئے، تو اب میں نواب احمد بخش خان سے بالکل مایوس ہو گیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ انصاف پسند حکمران اپنے متعلقین میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان کا وسیلہ اور واسطہ تلاش کروں! کیوں نا کسی تیسرے آدمی کے بغیر میں خود ہی سر چارلس مٹکاف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام معاملات شروع سے لے کر آخر تک ان کے گوش گزار کر دوں!

لیکن قرضخواہوں کے شور و غوغا کے ڈر سے میرا دلی جانا ممکن نہیں تھا، مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور آخر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے علاوہ انھی دنوں نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود کی خبر پھیلی۔ یقین تھا کہ سر چارلس

۱۳۔ بھرتپور کے قضیے کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ذکر غالب: ۵۷ (حاشیہ)

۱۴۔ گویا میرزا یوسف ۱۸۲۵ء سے پہلے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔

مشکاف بھی ان کی پذیرائی اور استقبال کے لیے ضرور جائینگے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ کانپور جاؤں اور وہاں سے ان کی معیت میں واپس آؤں، اور راستے میں کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مصیبت اور بیبسی اور قرض کی ساری رام کہانی ان سے کہوں اور انصاف کا طالب ہوں۔

(۱۴) غرض میں اس ارادے سے فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے جونہی کانپور پہنچا، میں وہاں بیمار پڑ گیا، یہاں تک کہ ہلنے جلنے تک کی سکت بھی جاتی رہی۔ چونکہ اس شہر میں کوئی ڈھنگ کا معالج نہ ملا، مجھے مجبوراً ایک کرایے کی پالکی میں گنگا پار لکھنؤ جانا پڑا۔ یہاں میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پر پڑا رہا[15] یہیں میں نے نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود اور بادشاہ اودھ کے ان کے استقبال کو جانے کی خبر سنی۔ لیکن ان دنوں میں چارپائی سے اٹھنے تک کے قابل نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ لکھنؤ کی آب و ہوا بالکل میرے راس نہیں آئی۔

(۱۵) میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب صاحب موصوف کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے میں جوں توں کر کے گرتا پڑتا باندہ (بوندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

(۱۶) اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور سے تو دلی جا نہیں سکا تھا، اب باندے سے کیسے اور کیونکر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے خیال کیا کہ آخر دلی اور کلکتے دونوں جگہ قانون تو وہی ایک ہے؛ مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت[16]

۱۵۔ اس سلسلے میں دیکھیے غالب کا خط ابن حسن خان کے نام؛ اس میں بھی قیام لکھنؤ کی مدت تقریباً پانچ ہی مہینے لکھی ہے (اردو ادب، جولائی ۱۹۵۲ء)

۱۶۔ نواب ذوالفقار علی بہادر کی وساطت سے انھوں نے باندے کے ایک شخص امین چند سے دو ہزار قرض لیا تھا؛ یہ روپیہ زادِ راہ مہیا کرنے کے کام آیا ہوگا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد صدر امین محمد علی خان (باندہ) نے دو سو روپیہ بھیجا تھا اور آگرے سے بھی ڈھائی سو کی رقم پہنچی تھی (نامہ ہای فارسی غالب: ۱۴)

نہیں تھی، مجھے مجبوراً خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے جانا پڑا[۱۷]۔ دو تین ملازم میرے ساتھ تھے، لیکن میں بہت کمزور اور تھکا ماندہ تھا۔ زادِ راہ اور کوئی آسایش کا سامان بھی نہیں تھا۔

(۱۷) مرشد آباد پہنچا تو یہاں مجھے نواب احمد بخش خان کی رحلت اور شمس الدین احمد خان کی جانشینی کی خبر ملی۔ چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خان کی جاگیر سے متعلق تھا، میں نے سوچا وہ زندہ ہوں یا مردہ، اس سے میرے معاملے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور کلکتے پہنچ گیا۔

(یہاں تک تو گزشتہ بیس برس کے واقعات تھے۔ اب میں نصراللہ بیگ خان کے خاندان کی اور اپنی ذاتی شکایات اور خاص اپنی درخواست، واضح کرنا چاہتا ہوں)

(۱۸) حضور والا،

(الف) نصراللہ بیگ خان کے متعلقین میں ایک شخص خواجہ حاجی نام تھا تین برس ہوئے اس کا جذام کے مرض سے انتقال ہوگیا اور اس کے بعد احمد بخش خان کی جاگیر سے اس کے دو ہزار اس کے بیٹوں کو ملنے لگے۔ خواجہ حاجی کا قصہ یہ ہے:

نصراللہ بیگ خان کے والد کے زمانے میں، جن کا نام قوقان بیگ خان تھا، ایک نوجوان خواجہ میرزا نام ان کے ہاں اسواروں کے دستے میں بارگیر (سائیس) کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ پانچ روپیہ ماہانہ تھی[۱۸]۔ قوقان بیگ خان کی بیوی (یعنی نصراللہ خان کی والدہ) کی ایک بیوہ ہمشیر تھی، جس کے ایک ناکتخدا لڑکی تھی۔ نصراللہ بیگ خان کی والدہ اپنے دوسرے متعلقین اور لواحقین کی طرح اپنی اس بہن اور بھانجی کی بھی پرورش اور نگہداشت کرتی تھیں۔

قوقان بیگ خان نے اپنی بیوی کی اس یتیم بھانجی کا نکاح خواجہ میرزا سے کر دیا۔ یہ خواجہ حاجی، انہی دونوں کا بیٹا تھا۔ دوسرے لفظوں میں خواجہ حاجی کی والدہ، نصراللہ بیگ خان کی والدہ کی بہن کی بیٹی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے درمیان یا ان کے والدین ہی کے درمیان نہ پہلے،

۱۷۔ سفر کے اس حصے سے متعلق دیکھیے، ذکرِ غالب: ۶۲-۶۳

۱۸۔ یہی بات انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کو بھی لکھی ہے۔ (متفرقاتِ غالب: ۶) وہاں البتہ اس شخص کا نام نہیں لکھا اور تنخواہ کا تعین بھی نہیں کیا۔

نہ اب ہی کوئی اور رشتہ یا تعلق تھا۱۹

(ب) نصراللہ بیگ خان کے جائز وارثوں میں سب سے پہلے میری دادی (یعنی نصراللہ بیگ خان کی والدہ) تھیں، جنھیں نواب احمد بخش خان اپنی زندگی میں پندرہ سو روپیہ سالانہ دیتے رہے۔ اور ان کی وفات۲۰ کے بعد یہی رقم ان کی سب سے بڑی بیٹی (یعنی نصراللہ بیگ خان کی سب سے بڑی بہن) کو ملنے لگی۔ یہ انھیں اب بھی ملتی ہے۔ اس سے وہ اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے گزارے کا انتظام کرتی ہیں لیکن چونکہ ان کے مرحوم بھائی اور والدہ کے پرانے ذاتی ملازم اور متعلقین بھی انھیں کے ساتھ رہتے ہیں، اس لیے یہ رقم کسی طرح ان کے خرچ کو کفایت نہیں کرتی۔ انھوں نے گھر کا تمام اثاثہ بیچ کھایا ہے اور اب ہزاروں کی مقروض ہیں۲۱۔

(ج) میرے چچا نصراللہ بیگ خان کے وارثوں میں یوسف علی خان میرا بھائی ہے، جو مرحوم کا بھتیجا ہے۔ نواب احمد بخش خان نے اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی۔ وہ کئی مرتبہ احمد بخش خان کے پاس گیا، اور اپنا دکھڑا رویا۔ لیکن نواب صاحب ہمیشہ طرح طرح کے وعدوں سے اس کا منہ بند کر دیتے اور وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا آتا۔ آج تک اس کا گزارا گھربار کا سامان بیچنے اور میری امداد پر رہا ہے۔ وہ جوان تھا اس کی شادی ہو چکی تھی۔ خرچ بڑھ رہا تھا اور آمدنی مفقود۔ انھیں تفکرات نے

۱۹۔ اس سے معلوم ہوگا کہ قمرالدین راقم نے (احوال غالب: ۳۰) اور ان کے تتبع میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے (مضامین فرحت حصہ چہارم میں) جو لکھا ہے کہ میرزا کے پردادا اور خواجہ امان کے پردادا آپس میں بھائی بھائی تھے، تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

البتہ جہاں تک "اب" کا تعلق ہے، یہاں ایک دور کا رشتہ ثابت کیا جا سکتا ہے یعنی غالب کی بڑی ہمشیر چھوٹی خانم کے شوہر میرزا اکبر بیگ تھے، اور میرزا اکبر بیگ کی ایک بہن خواجہ حاجی کو بیاہی تھیں (رشتہ آپ خود متعین کر لیجیے) ضمناً یہ بھی لکھ دوں کہ میرزا اکبر بیگ کے ایک بھائی میرزا افضل بیگ تھے؛ یہ میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے پردادا تھے۔

۲۰۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں (حاشیہ نمبر ۱۲)، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپریل ۱۸۲۸ء سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

۲۱۔ میرے خیال میں یہ وہی پھوپھی ہے جس کے انتقال کی خبر انھوں نے ۲۲ دسمبر ۱۸۵۲ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو دی تھی (خطوط غالب: ۱۳۵-۱۳۶)۔ ان کا انتقال اس سے دو دن پہلے ۲۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو ہوا تھا۔

اس کے دماغ کا توازن بگاڑ دیا۔ اس پر ہذیانی اور جنون کی کیفیت طاری ہوگئی اور اب وہ مستقل بیمار ہے۔ میں چھ سو روپیہ سالانہ اس کے علاج پر خرچ کرتا رہا ہوں۔ اس کے بیوی ہے، ایک لڑکی ہے، جو ۱۳ کی صحت کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی نوکر چاکر اور خادمہ، ملازم اس کے علاوہ ہیں۔ چار آدمی تو صرف اس کی نگرانی اور دیکھ بھال ہی کے لیے چاہییں۔ آج تک اس کی بیوی گھر کی چیز بست بیچ بیچ کر گزارا کرتی رہی ہے۔ لیکن تابکے۔

(د) نصراللہ بیگ خان کا اور وارث آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسداللہ خان ہے اور عرف میرزا نوشہ۔ احمد بخش خان نے مجھے پندرہ سو سال دیے تھے۔ میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بیچ بیچ کر زندگی بسر کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے نانا خواجہ غلام حسین خان نے بھی کچھ جاداد چھوڑی تھی۔ وہ آگرے کے چوٹی کے عمائد میں سے، اور نواب نجف خان کے دربار کے مشہور امرا میں سے تھے۔ آخر میں نے ضرورت سے مجبور ہو کر آگرہ چھوڑا، اور دلّی کی سکونت اختیار کی، جو میرے بزرگوں کا اصلی وطن تھا۔ یہاں میں نے بسر اوقات کے لیے والد اور نانا کی متروکہ جاداد بیچ ڈالی اور اس کے باوجود آج مجھ پر بیس ہزار کا قرض ہے۔

(۱۹) اب میں دو مہینے سے اس داورگاہ (کلکتہ) میں آیا ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ حکومت میری شکایتوں کا ازالہ کرے، تاکہ میں خوش و خرّم واپس جاؤں، اور اطمینان و آرام سے وہاں رہ کر اپنے بھائی کا علاج کروا سکوں۔ اور اگر حکومت نے میری شنوائی نہ کی، تو میں کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤنگا، مثلاً عرب ہے، عجم ہے، اور زندگی کے باقی ایّام کہیں بھیک مانگ کر گزار دونگا کیونکہ میرے جو تعلقات حکومت سے ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ تو ناممکن ہے کہ میں ہندستان میں کسی کے دروازے پر جا کر خیرات مانگوں۔

(۲۰) الغرض میری درخواست ہے:

حکومت نے جب نواب احمد بخش خان کو جاگیر دی ہے، تو شرط یہ تھی کہ وہ اس کی ۲۰۔۳۰ ہزار[۲۲] جمع، سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہینگے۔ پھر جب نصراللہ بیگ خان فوت ہوئے، تو فیصلہ ہوا کہ وہ ان کے اسواروں کے دستے میں سے پچاس اسواروں کی دیکھ بھال کرینگے اور نیز مرحوم کے پسماندگان کو گزارا دینگے اور ان دونوں مدّات کے عوض میں یہ جمع معاف کردی گئی تھی۔ حکومت تحقیق کرے، اور نواب شمس الدّین احمد خان سے گزشتہ ۲۰۔۲۲ برس کا حساب طلب کرے،

۲۲۔ ٹھیک رقم پچیس ہزار روپیہ سالانہ تھی۔

تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے کتنے اسوار رکھے۔ ان پر کیا خرچ ہوا اور نصراللہ بیگ خان کے خاندان کے گزارے کے لیے کتنی رقم ادا ہوئی۔

نواب احمد بخش خان نے نصراللہ بیگ خان کے خاندان کے لیے خود بخود ہی پانچ ہزار سالانہ کی رقم مقرر کر دی اور اس میں سے بھی ہمیں صرف تین ہزار ملے کیونکہ خواجہ حاجی کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ گویا وہ تمام رقم جو نواب احمد بخش خان کی جاگیر میں سے نصراللہ بیگ خان کے پسماندگان کے لیے مقرر ہوئی تھی اور ہمیں ادا کی جانا چاہیے تھی، اس میں سے ہمیں صرف تین ہزار سالانہ ملے۔ اور وہ بھی صرف دو آدمیوں کو، یعنی نصراللہ بیگ خان کی والدہ، (اور اب ان کی ہمشیرہ) اور ایک بھتیجے کو، دوسرے رشتے دار بالکل نظرانداز کر دیے گئے۔ پس نہ یہ رقم ہی کافی تھی، نہ اس کی تقسیم کا طریقہ ہی درست تھا[۲۳]

میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے خاندان کا ایک ملازم میرے ساتھ برابر کا حصہ دار ہو[۲۴]

اور نہ میں اس وظیفے کے لیے کسی اور کے سامنے ہاتھ ہی پھیلانے کو آمادہ ہوں[۲۵]

حکومت ہی میری سند ہے، میری ضمانت ہے، میرا ثبوت، میری قوت، اور میری آماجگاہ ہے۔

حکومت مہربانی کر کے اس معاملے کی پوری تحقیقات کرے۔ لارڈ لیک کی ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۶ء کی خط و کتابت اور سندات ملاحظہ فرمائی جائیں؛ یہ کلکتے کے دفتر میں موجود ہونگی۔ ان سے یقیناً معلوم ہو جائیگا کہ نواب احمد بخش خان کو جو یہ تین لاکھ مالیت کی جاگیر دی گئی تھی، تو اس کے ساتھ کیا شرط وابستہ تھی، جس کی بنا پر اسے یہ ہزاروں کی جمع معاف ہوئی۔ شرط یہی تھی کہ وہ اسے نصراللہ بیگ خان کے خاندان کو ادا کریں۔ حکومت دیکھیگی کہ ہمیں تین ہزار سالانہ سے ایک حبہ زیادہ نہیں ملا۔

دو ہزار سالانہ جو خواجہ حاجی کو ملتے رہے، تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، اور وہ اس رقم سے کسی صورت میں بھی وضع نہیں ہونا چاہییں، جو ہمارے خاندان کے لیے مقرر ہوئی تھی۔

حکومت دیکھیگی کہ جو رقم اس نے پچاس اسواروں کی دیکھ بھال اور تنخواہ وغیرہ کے لیے معاف کی تھی، ان کی جگہ کوئی اسوار رکھا ہی نہیں گیا۔ پس، جب وہ شرط ہی پوری نہیں کی گئی، تو معافی کس بات کی لیکن اس روپے پر میرا یا میرے خاندان کا کوئی حق نہیں۔ یہ رقم حکومت کے خزانے میں جانا چاہیے۔ نصراللہ بیگ خان کے پسماندگان اور وارثوں کی تحقیق کی جائے۔ معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کے جائز وارث صرف اس کی تین بہنیں، اور دو بھتیجے ہیں۔ جو تین ہزار سالانہ ہمیں ملتا رہا ہے،

اسے منہا کر کے باقی رقم ان افراد کے درجے اور ضروریات اور استحقاق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان میں تقسیم کر دی جائے[۲۶]۔
اسی اساس پر حکومت ان پانچوں افراد کا حصہ بھی متعین کر دے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی الگ سند عطا کر دی جائے، جس کے مطابق آیندہ وہ اپنا اپنا وظیفہ حکومت کے خزانۂ دہلی سے وصول کرتے رہیں[۲۷]۔

---

۲۳ - ۲۷ ۔ گویا مختصراً درخواست یہ تھی :
(۱) موجودہ تین ہزار یا پانچ ہزار کا وظیفہ ناکافی ہے، اور اس کی تقسیم ٹھیک طریقے پر نہیں ہوئی ؛ (۲) خواجہ حاجی (یا اس کی اولاد کو) ہمارے وظیفے میں سے کچھ نہیں ملنا چاہیے ؛ (۳) تین ہزار سالانہ وضع کر کے گزشتہ اتنے برس کا بقایا دلایا جائے ؛ (۴) وظیفے حسبِ حیثیت پھر سے متعین کیے جائیں ؛ (۵) تمام وظیفہ خواروں کو الگ الگ سند دی جائے ؛ اور (۶) یہ وظیفے آیندہ فیروز پور کی جاگیر کی بجائے انگریزی خزانۂ دلّی سے ادا ہوں۔
یہی باتیں اس قصیدے میں بھی لکھی ہیں، جو انھوں نے ۱۸۳۵ء میں سر چارلس مٹکاف کی مدح میں لکھا تھا (قصیدہ ۳۵)۔ ہاں، اس قصیدے میں انھوں نے اپنے لیے مزید اعزاز و اکرام اور خطاب و خلعت کے مطالبے کا اضافہ کر دیا ہے۔

قتیل پنجابی الاصل تھا

۱۹۳۸ء میں ذکرِ غالب کی اشاعت (اول) کے بعد غالب کے متعلقات پر کام شروع کیا، تو قدرتاً قتیل کا نام بھی سامنے آیا۔ سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ غالب نے اسے فریدآبادی کہا ہے، لیکن اس کی تصدیق ضروری تھی۔ اس سلسلے میں متعدد تذکرے دیکھے لیکن مجھے مصحفی کے سوا اور کسی پر اعتبار نہیں ہوا۔ مصحفی اور قتیل میں قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے۔ قتیل ہی نے مصحفی کو تذکرہ فارسی گویان "عقدِ ثریا" مرتب کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس لیے میرے نزدیک اس کا بیان خاص توجہ کے لائق تھا۔ مصحفی عقدِ ثریا میں قتیل کے حالات میں لکھتا ہے[۱]: دراصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند۔ اس لفظ پٹالی سے ان کا وطن مراد ہے۔ پٹالی یا پٹیالی، ضلع ایٹہ (یوپی) میں ایک مختصر سا قصبہ ہے؛ اور اس کا نام اس لحاظ سے ہمیشہ زندہ رہیگا کہ اسے حضرت امیر خسرو کا وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میرا ذہن سب سے پہلے اسی کی طرف گیا۔ لیکن جب میں نے اس جگہ تحقیق کی، تو بےسود؛ وہاں کے کسی قدیم گھرانے میں کوئی شخص مرزا محمد حسن قتیل کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے، اصل میں پٹیالہ ہو، جو کاتبوں کی مہربانی سے پٹالی بن گیا۔ لیکن پٹیالہ میں پوچھ گچھ کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چونکہ ایک آدھ تذکرہ نویس نے لاہور کا ذکر بھی کیا ہے، اس لیے میں نے یہاں بھی کھوج لگانے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

اگرچہ یہ غالب کے سلسلے میں ایک ضمنی بحث تھی، اور میرے اصلی موضوع سے براہِ راست متعلق بھی نہیں تھی کہ میں اسے اتنی اہمیت دیتا، تاہم مجھے اپنی محنت کے رائگاں جانے کا رنج ضرور تھا۔ سب سے زیادہ تعجب مصحفی پر تھا کہ اگر اس بھلے آدمی کو یقین نہیں تھا، تو اس نے "پٹالی" کیوں لکھ دیا۔

۱۔ عقدِ ثریا: ۴۶

یوں جستجو کرنے کو تو میں نے ٹپیالی تک کی خاک چھانی، لیکن اس دوران میں ایک بات رہ رہ کے میرے ذہن میں آتی تھی کہ قتیل کا اصلی وطن کہیں پنجاب میں ہونا چاہیے۔ اوّل، اس لیے کہ بھنڈاری خاندان پنجاب کی پیداوار ہے۔ دوسرے، قتیل کے والد کا نام، درگاہی مل۔ یہ نام ایسا ٹھیٹ پنجابی ہے کہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل میں یہ خیال نہیں گزرا کہ وہ دلّی یا لکھنؤ یا فرید آباد کے رہنے والے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ابتدائی تگ و دَو کی ناکامی کے بعد میں مجبوراً خاموش ہو گیا، حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں نگار کا مصحفی نمبر شائع ہوا۔ اس میں ایک مضمون مشیر احمد علوی کاکوروی کا تھا، جس میں انھوں نے "ید بیضا" از مصحفی کے حوالے سے قتیل کا وطن بٹالہ لکھا تھا۔ "ید بیضا" کا وجود خارج میں ہے یا نہیں، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور مجھے اس سے سروکار نہیں۔ لیکن اس میں "قتیل کا وطن بٹالہ" کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام دیا۔ میں نے ایک دوست کو لکھا کہ ذرا معلوم کر کے مطلع کیجیے کہ کیا بٹالہ کے بھنڈاری خاندان میں کوئی قتیل کو جانتا ہے! بارے، اب کے تیر نشانے پر بیٹھا، اور وہ معلومات جن کے لیے میں سال بھر سے سرگرداں تھا، سامنے آگئیں۔

بٹالہ، ضلع گورداسپور (پنجاب) کا مشہور قصبہ ہے۔ امرتسر سے جو ریلوے لائن پٹھان کوٹ جاتی ہے، یہ اس پر ہے، اور خود ریلوے جنکشن بھی ہے۔ یہاں کا بھنڈاری خاندان، بہت قدیم اور علم دوست خاندان ہے۔ قتیل اسی خاندان کے فرد تھے۔

سب سے پہلے ان کے شجرۂ نسب کا ضروری حصہ ملاحظہ ہو:

اچنت رائے
- مہر چند
  - امر سنگھ
    - چوہڑ مل
      - رائے انند سنگھ
        - رائے کشن چند
          - رائے بھاگ سنگھ
            - رائے کانشی رام
              - رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری ایم اے
- صورت سنگھ
  - دیوان فتح چند
    - رائے لعل جی مل
      - درگاہی مل
        - دیوانی سنگھ (مسلمان شد تخلص مرزا قتیل در لکھنؤ)
        - جواہر سنگھ (اولادش در لکھنؤ)
      - بہادر سنگھ
        - وصونکل سنگھ (اولادش در لکھنؤ)
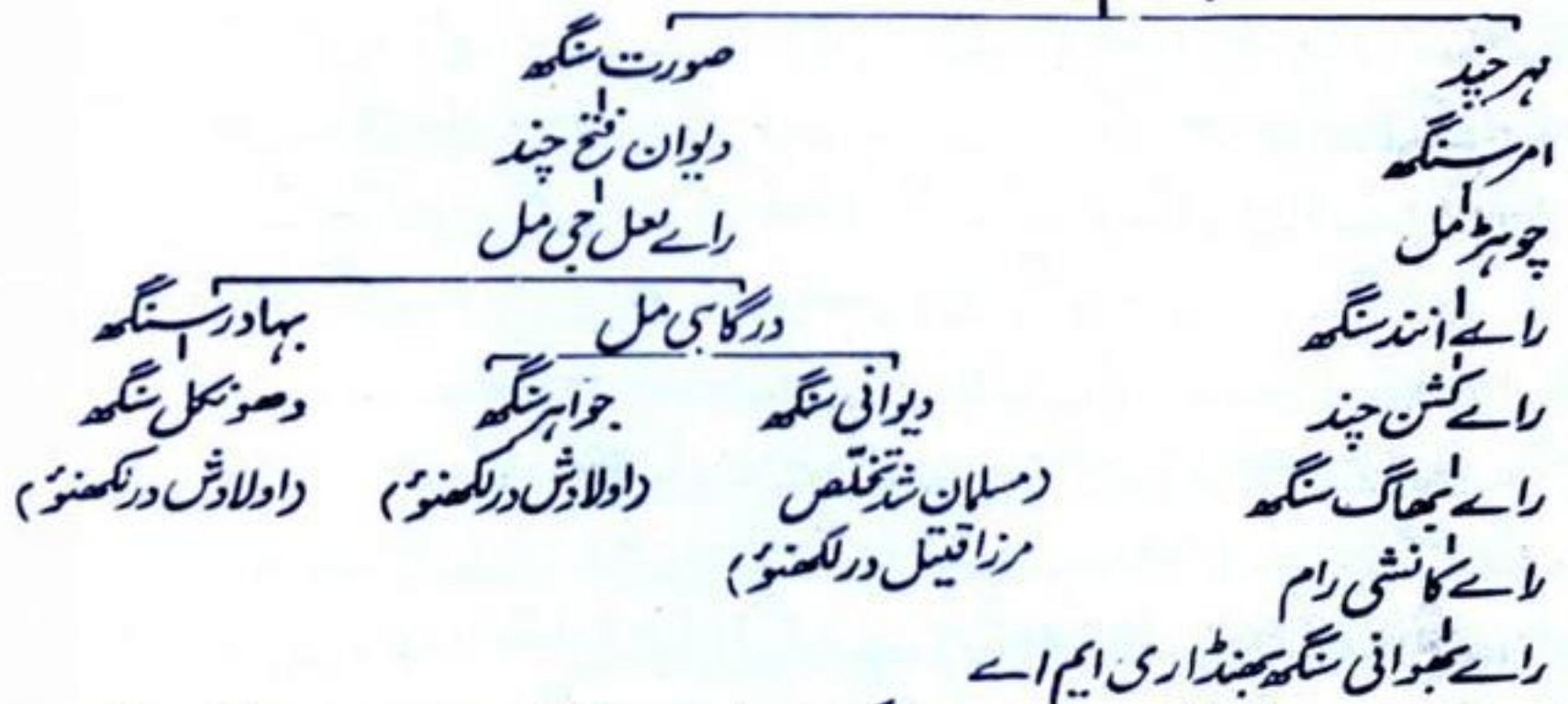
مجھے شجرے کے اس حصے کی نقل جناب بھوانی سنگھ ایم اے سے ملی تھی، جو اسی خاندان کے باقیات

صالحات میں سے تھے۔ مکمل شجرہ جو بہت مفصّل اور ضخیم ہے، ان کے پاس موجود تھا، اور یقیناً اب بھی ان کے ورثہ کے پاس ہوگا۔ اس شجرے سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ قتیل کا خاندان ابتدا میں بٹالہ (ضلع گورداسپور۔ پنجاب) کا رہنے والا تھا۔

۲۔ قتیل کا اصلی نام دیوانی سنگھ تھا ("ن" کے ساتھ)، نہ کہ دیوالی سنگھ ("ل" کے ساتھ) جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے۔

۳۔ رائے بھوانی سنگھ کا خیال تھا کہ بٹالہ سے نقلِ مکان قتیل کے دادا رائے لعل جی مل نے کیا تھا۔

۴۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ نقلِ مکان قتیل کی پیدائش کے بعد ہوا۔

۵۔ شجرے میں قتیل کے حقیقی بھائی جواہر سنگھ اور چچا کے بیٹے دھونکل سنگھ، دونوں کے نام کے ساتھ لکھا ہے: "اولادش در لکھنؤ"۔ اس سے ثابت ہوا کہ کم از کم جب کسی نے یہ شجرہ مرتب کیا ہے، تو اس زمانے میں ان دونوں کی اولاد لکھنؤ میں موجود تھی۔

۶۔ اس خاندان کا پیشہ شروع سے حکومتِ وقت کی ملازمت رہا۔ فارسی کا ذوق بھی پرانا ہے۔ اس شجرے کے دوسرے حصّے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ عالمگیری کے مشہور مؤرخ منشی سجان رائے بھنڈاری، جن کی تصنیف خلاصۃ التواریخ بعض لحاظ سے نہایت بلند پایہ اور بےنظیر کتاب ہے، اسی خاندان سے تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ بٹالے سے یہ ہجرت بھی ملازمت ہی کے لیے ہوئی ہوگی۔

اسد علی انوری (مصنّف قتیل اور غالب) کے بیان کے مطابق اس خاندان کے جو افراد فریدآباد میں موجود ہیں، ان کے پاس اپنا شجرۂ نسب ہے، جو درگاہی مل تک ختم ہو جاتا ہے[۲]۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، قتیل نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی۔ پس، خاندان کے یہ لوگ جواہر سنگھ ہی کی اولاد ہو سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ بعد کو جواہر سنگھ لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے فریدآباد چلے آئے ہوں؛ اور بہادر سنگھ اور دھونکل سنگھ والی شاخ فیض آباد (لکھنؤ) میں رہ گئی ہو۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری کے خیال میں بٹالے سے نقلِ مکان رائے لعل جی مل نے کیا تھا؛ نیز یہ نقلِ مکانی قتیل کی پیدائش کے بعد ہوا۔ لیکن آغا حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی کی شہادت قتیل کی بٹالے میں پیدائش کے خلاف ہے۔ انھوں نے اپنے ضخیم تذکرے "نشترِ عشق" میں قتیل کا خاصا مفصّل ترجمہ شامل کیا ہے۔ اس کا جو خلاصہ پروفیسر مختار الدّین احمد نے

۲۔ "قتیل کا وطن"، از سید اسد علی انوری، مطبوعہ نگار، لکھنؤ: مئی ۱۹۴۲ء: ۱۰

[د]یا ہے، میں اسے درجِ ذیل کرتا ہوں :

قتیل کے آباد اجداد ایک چھوٹے سے قصبے بٹالہ کے رہنے والے تھے (پٹیالہ کے قریب جو، لاہور کے قریب واقع ہے) ۔ کچھ زمانے کے بعد جدِ سوم (غالباً صورت سنگھ ۔ احمد) ایک شخص کے ساتھ جو کھتری تھا، اور جس سے موانست اور برادری تھی، بٹالہ سے ہجرت کر کے باغپت چلا آیا ۔ قتیل کے باپ اور دادا ۔ درگاہی مل اور رائے لال جی مل کی ولادت یہیں باغپت میں ہوئی ۔ ۱۱۳۷ھ میں رائے لال جی مرگیا ۔ اس کے بعد درگاہی مل نے باغپت کو چھوڑ کر ڈاسنہ میں، جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اور دہلی سے ۷ کوس پر واقع ہے، بود و باش اختیار کی ۔ تین سال تک وہاں قیام کیا تھا کہ (۱۱۴۰ھ میں ۔ احمد) نواب ہدایت علی خاں نے بمدِ نظرِ استحقاقِ روابط و تعلقات جو سید فیض اللہ اور رائے لال جی مل میں تھے، قتیل کے باپ درگاہی مل کو اپنے پاس بلالیا ۔ بہت دلجوئی کی اور ہزار روپیہ ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر (پر) اہل وعیال کے ساتھ رہیں ۔ درگاہی مل مدت العمر کبھی ڈاسنہ رہا اور کبھی نواب ہدایت علی خاں کے یہاں ۔ انھیں دنوں ۱۱۷۲ میں شاہجہان آباد میں قتیل کی ولادت ہوئی ۔

[ا]س سے معلوم ہوا کہ

۱۔ قتیل کے بزرگ بٹالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے ۔

۲۔ بٹالہ سے نقل مکان رائے لعل جی مل نے نہیں، بلکہ ان کے جدِ سوم (غالباً صورت سنگھ) نے کیا تھا ۔

۳۔ یہ ہجرت اتنے قدیم زمانے میں ہوئی کہ قتیل کے دادا اور والد، دونوں کی ولادت باغپت میں ہوئی ۔

۴۔ رائے لعل جی مل کی ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ - ۱۷۲۵ء) میں وفات ہوئی ۔

۵۔ قتیل کی ولادت ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ - ۱۷۵۹ء) میں شاہجہاں آباد میں ہوئی ۔

[چ]ونکہ عاشق کے قتیل سے مراسم تھے، اور ان کی آپس میں خط وکتابت تھی، اس لیے خیال ہوتا ہے [ک]ہ انھوں نے یہ حالات خود قتیل سے حاصل کیے ہونگے ؛ اسی لیے یہ زیادہ اعتماد کے لائق ہیں، [او]رہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رائے بھوانی سنگھ نے شجرۂ نسب سے خاندان کی ہجرت اور قتیل کی پیدائش

[۱]۔ مضمون "قتیل دہلوی تھا یا فرید آبادی ؟" مشمولہ نقوش، لاہور (ادبِ عالیہ نمبر) : ۶۹ - ۷۰ (اپریل ۱۹۶۰ء)

سے متعلق جو نتائج اخذ کیے، وہ درست نہیں تھے۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے اپنے اسی محولۂ فوق مضمون میں قتیل کے فرید آبادی ہونے سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے مختلف مآخذ سے یہ ثابت کیا ہے کہ قتیل دتی میں پیدا ہوا، بعد کو بھی جب کبھی اس کے قیام کا ذکر آیا ہے، دتی میں، کسی نے اس کے قیام فرید آباد کا نام تک نہیں لیا۔ اس صورت میں اسے دہلوی کہنا چاہیے؛ غالب نے اسے فرید آبادی کہہ کر غلطی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

جیسا کہ سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی لکھا ہے[۴]، اس زمانے میں فرید آباد کو دتی کے مضافات میں ہونے کے باعث دتی ہی کا ایک حصہ اور محلہ شمار کیا جاتا تھا۔ انشا نے "دریاے لطافت" میں، جس کی تصنیف میں خود قتیل ان کے شریک تھے (بلکہ اس کا آخری حصہ کاملاً ہے ہی قتیل کے قلم سے)، فرید آباد کو دتی کے "بازاروں اور محلّوں" میں شمار کیا ہے[۵]۔ اور قتیل بھی انشا کے اس بیان سے متفق ہیں کیونکہ یہ کتاب ان دونوں نے مل کر لکھی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قتیل فرید آباد میں رہتے تھے، اور مضافاتِ شہر میں مقیم ہونے کے باعث عرفِ عام میں دہلوی کہلائے۔

غالب نے البتہ اسے "فرید آبادی" کہہ کر اس کی تضحیک اور ہتک کرنا چاہی ہے۔ وہ یہ اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ قتیل دہلوی نہیں، بلکہ ایک بیرونی بستی کا رہنے والا تھا؛ اس لیے گنوار اور غیر مستند تھا۔

۴۔ مضمون "قتیل کا وطن"، مشمولۂ اردو: جنوری ۱۹۴۵ء

۵۔ دریاے لطافت (اردو ترجمہ): ۱۵۰

ایک معاصر اندراج

آخری دور میں آغا حجو شرف لکھنوی بوجوہ خاصی شہرت کے مالک ہوئے ہیں۔ ان کا اصلی نام سید جلال الدین حیدر خان تھا۔ لیکن آخری بادشاہِ اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے انھیں خطاب سیادت حسن خان ملا تھا، اس لیے وہ اپنے نام کے شروع میں اس کا بھی اضافہ کرتے تھے، یعنی پورا نام لکھتے تھے: سیادت حسن خان سید جلال الدین حیدر خان۔ ان کے والد سید محمد خان میرن صاحب تھے، اور وہ بیٹے تھے سید محمد حمید خان بہادر مشہدی کے۔ اس خاندان کے یہی بزرگ سب سے پہلے ایران سے ہندستان آئے، لکھنؤ پہنچے، یہاں مناسب آؤ بھگت ہوئی، معقول وظیفہ مقرر ہوا، جاگیر ملی اور خان بہادر کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔

آغا حجو شرف اردو میں شعر کہتے تھے، اور خواجہ حیدر علی آتش کے نامور شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ ان کا کلام "دیوان شرف" کے عنوان سے چھپا ہوا موجود ہے، اس میں کم و بیش آٹھ ہزار شعر ہوں گے یہ ان کی وفات کے بعد مطبع جعفری، واقع نخاس جدید، لکھنؤ میں طبع ہوا تھا۔ دیوان کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طباعت کا خرچ سر راجا محمد امیر حسن خان بہادر والیِ محمود آباد نے جیبِ خاص سے ادا کیا تھا۔

آغا حجو شرف، سلطان واجد علی شاہ کے سمدھی تھے، یعنی واجد علی شاہ کے ولی عہد میرزا حامد علی کی بیگم، شرف کی صاحبزادی تھیں۔ جب ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا اور واجد علی شاہ کو معزول کر دیا، تو بادشاہ اپنے خاندان کے ساتھ کلکتے چلے گئے تھے۔ اس موقع پر شرف نے بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، اور ان کے ساتھ جلاوطن ہو گئے۔ بدقسمتی سے کلکتے کے دورانِ قیام ہی میں میرزا حامد علی ولی عہد کا انتقال ہو گیا، جس کا شرف کو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔

شرف نے انگریزوں کے خوش کرنے کو ایک مثنوی بعنوانِ "شکوہ فرنگ"، کہی تھی۔ اس میں شعر ہے:

ہوئی نظم کچھ دن کی میعاد میں
ہزار و دو صد، چار و ہشتاد میں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸) میں لکھی گئی۔ لیکن اس کے برعکس 'دیوان شرف' میں یہ "قطعۂ تاریخ تصنیفِ کتاب شکوۂ فرہنگ مصنفِ دیوانِ ہذا" ملتا ہے[۱]:

دو لفظی ہوئی فکر تاریخ کی
کہی جب کتاب "شکوۂ فرنگ" (کذا)
بیاں کر چکے ہم جو نیرنگِ غدر
کہی ہم نے تاریخ "آہنگِ غدر" (۱۲۸۰)

اس سے (۱۲۸۰) برآمد ہوتے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ جو چیز ۱۲۸۰ھ میں مکمل ہو چکی تھی، وہ دوبارہ ۱۲۸۴ میں کیوں کر کہی گئی!

اس نظم کا ایک خطی نسخہ برٹش میوزیم، لندن کے کتابخانے میں میری نظر سے گزرا ہے[۲]۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا ترقیمہ ہے:

مصنفِ دفترِ ہذا سیادت حسن سید جلال الدین حیدر خان عرف آغا مجو شرف، وطنِ جدی ایران، ساکنِ شہر لکھنؤ، محلہ مولوی گنج، از مدت مقیم بکلکتہ مٹیا برج بدولتخانۂ شہزادۂ حضور پُر نور ابو النصرت کیوان قدر، ہمایوں جاہ، قیصر حشم، صاحب عالم، میرزا محمد حامد علی بہادر دام شوکتہ،

تواریخ ہذا شکوۂ فرنگ، بشہرِ کلکتہ دار الامارتِ انگریز بہادر دام اقبالہ بتاریخ بست و ہفتم شہر شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق سیزدہم ماہِ دسمبر ۱۸۶۸ عیسوی روز یکشنبہ بہ اتمام نظم رسیدہ جمع شدہ موسوم و مشہور بشکوۂ فرنگ گردید۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف
تحریر فی التاریخ بست و ہفتم شہر شعبان ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق سیزدہم ماہِ دسمبر ۱۸۶۸ء

مہر مصنفِ دفترِ ہذا

۱۲۸۵
بہادر عرف آغا مجو شرف
جلال الدین حیدر خان
سیادت حسن سید

اس مثنوی کے اختتام کے قریب انھوں نے اپنے اور اس مثنوی کے بارے میں بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

۱۔ دیوانِ شرف: ۳۴۹

۲۔ بلوم ہارٹ: ۹۰

سنو صاحبو! ہے مرا تو یہ حال | کہ میں تو گنہگار ہوں بال بال
اک ادنیٰ میں بندہ ہوں اللہ کا | ہوا خواہ سرکارِ ذیجاہ کا
جہاں میں تخلص ہے میرا شرف | وہ مشہور و معروف ہے ہر طرف
سیادت حسن خاں مرا نام ہے | زمانے میں مشہور وارقام ہے
جلال الدّین حیدر بھی ہے میرا نام | ہوا خواہِ سرکار ہوں، لاکلام
صحیح النّسب ہے مرا خاندان | ریاست، سیادت بہم ہیں یہاں
یہاں سرفرازی قدامت سے ہے | وسیلہ یہی دامانِ دولت سے ہے
عجب بات دل میں یہ آئی مرے | یکایک یہ دل میں سمائی مرے
شجاعت یہ حکّام کی نظم کی | یہ کلکتے میں مثنوی نظم کی
ہوئی نظم کچھ دن کی میعاد میں | ہزار و دو صد، چار و ہشتاد میں
مرتّب ہوا جمِ تیر نگِ جنگ | تو نام اس کا رکھا: "تنکوہِ فرنگ" [۱۳۹] (ص ۲ الف و ب)

اس مثنوی میں شرف نے "غدر" (۱۸۵۷ء) کے زمانے میں شمالِ ہند کے مختلف شہروں کے جستہ جستہ حالات قلمبند کیے ہیں، جہاں بظاہر وہ خود گئے تھے۔ اسی ضمن میں انھوں نے ان شہروں کے بعض کابر کا ذکر بھی کیا ہے، جن سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

دلّی کے بیان میں جہاں اور اصحاب کا تذکرہ ہے، وہیں غالب سے متعلق بھی چند شعر ملتے ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں:

مرزا نوشاہ اسد اللہ خان بہادر شاہجہان آبادی متخلص بہ غالب عمائد نامی۔

جو دہلی میں یہ مرزا نوشاہ ہیں | یہ شاعر عمائد ہیں، ذیجاہ ہیں
تخلص ہے غالب، بڑے نامور | عجب زندہ دل، عالم و خوش سیر
یہ بیشک ہیں اوستادِ اہلِ زباں | سمندر طبیعت ہے، ہر علم داں
یہ ہیں فارسی گوئی میں بےمثال | بڑے ذوفنون اور اہلِ کمال
ہوئی گفتگو ان سے جب غدر میں | جگہ پائی حکّام سے صدر میں
کلام ان کا لندن روانہ ہوا | عجائب وہ افسوں فسانہ ہوا
مؤثر جو تھی نظم، اثر کر گئی | جہاں کے دلوں میں وہ گھر کر گئی
ہوا حکم ملکہ کے دربار سے | کہ پنشن ملے ان کو سرکار سے

عمائد تو تھے، اور نامی ہوئے — ہوئی پنشن ان کی، یہ نامی ہوئے
یہ نامی تو تھے، نامور رہ گئے — جو دشمن تھے، مونہہ دیکھ کر رہ گئے

[ص ۳۹ (ب) ... ۴۰ (الف)]

ان اقتباسات سے آغا حجو شرف کے علم اور فنِ شاعری کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں قائم ہوتی۔ اقتباسِ اول میں ارقام (شعر ۴) اور بجم (شعر ۱) ؛ اور اقتباسِ دوم میں عمائد (شعر ۱، ۹)، خوش سیر (شعر ۲)، ہر علم داں (شعر ۳)، مصرعِ ثانی شعر ۶، شعر ۹ میں قافیہ —— ان سب مقامات کی صحت محلِ نظر ہے۔ اسی سلسلے میں دو اور شعر بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، جہاں ہجے غلط لکھے ہیں:

جو جرنیل صاحب کی تھی "ضربات" — رہائی ہوئی، دی انھیں بھی نجات (ص ۴۹)
مالک میں، بالکل، فساد اب نہیں — کہیں بند ہیں، بد نہاد اب نہیں (ص ۵۲)

اس طرح کی غلطیوں سے دیوان بھی پاک نہیں ہے۔

بہر حال شرف کی شاعری سے قطع نظر غالب سے متعلق یہ معاصرانہ (غیر مطبوعہ) اندراج اپنی جگہ اہم اور دلچسپ ہے۔ ہمارے پاس غالب کے بارے میں معاصر لکھنوی اہلِ قلم کی تحریریں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سے پہلے غالباً صرف خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کی میرزا سے مختصر ملاقات کا ذکر ملتا ہے[۲]۔ اس لیے بھی شرف کے یہ چند شعر قابلِ لحاظ ہیں۔

۲۔ اردوے معلی: دیباچہ (ط)

"سکّہ" کا الزام اور اس کی حقیقت

میرا شہر میں ہونا حکّام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہذا طلبی نہیں ہوئی (نوشتہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)[1]

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا، کسی مخبر نے یہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں، فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دار و گیر سے محفوظ ہوں، کسی طرح کی بازپرس ہو، تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا (نوشتہ ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء)[2]

بہرحال، یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا، اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ (نوشتہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء)[3]

۱۔ اردوئے معلیٰ : ۵۸ ؛ خطوط غالب : ۳۴

۲۔ اردوئے معلیٰ : ۵۹ ؛ خطوط غالب : ۳۴-۳۵

۳۔ اردوئے معلیٰ : ۸۴ ، خطوط غالب : ۳۷۔

• انسان کتنا جلد باز ہے! جس وقت غالب نے تفتہ کو یہ خط لکھے تھے، انھیں کیا معلوم تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر کے ترکش میں کیسے کیسے زہر آلود تیر جمع ہیں! چونکہ انھیں اپنی بیگناہی کا یقین تھا، اس سے اندازہ کر کے انھوں نے لکھ دیا کہ کسی مخبر نے بھی میرے خلاف کوئی بیان نہیں دیا، حال آں کہ یہ بات حقیقت کے خلاف تھی اور اس کا علم بھی انھیں بہت جلد ہو گیا۔ سید حسین مرزا کو لکھتے ہیں[۳]:

اب میرا دکھ سنو۔ بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بیوفائی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار، جو گوری شنکر یا گوردیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خان غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا،

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر؛ خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا، تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہات کا لکھا ہوا گزرتا۔ اور آپ چاہے، حکیم احسن اللہ خان سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپ رہا، اب جو اس کی بدلی ہوئی، تو جانے سے دو ہفتہ پہلے ایک فارسی روبکاری لکھوا تا گیا کہ ..... یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا، ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ (نوشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء)

گویا غالب کا جو یہ خیال تھا کہ کسی مخبر نے میرے خلاف کوئی بات نہیں لکھی، اور اس لیے میں بیگناہ ہوں، غلط ثابت ہوا۔ صاحب کمشنر بہادر نے ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی۔ ایک مخبر نے، جس کا نام انھیں ٹھیک یاد نہیں رہا ——— گوری شنکر یا گوردیال یا کچھ اور ——— ان سے ایک سکہ منسوب کر کے انگریزوں کے پاس بھیجا تھا۔

۳۔ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بلاک ص د

اس مخبر کا ٹھیک نام گوری شنکر تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں جب دلّی پر دیسی سپاہ کا قبضہ تھا اور انگریزی فوج شہر سے باہر پہاڑی پر ڈیرے ڈالے پڑی تھی، انگریزوں کے بہت سے جاسوس شہر کی خبریں انھیں پہنچاتے رہتے تھے، اس زمانے میں یہ شخص بھی قلعے اور شہر کے حالات لکھ لکھ کر انگریزوں کو بھیجا کرتا تھا۔ اس کی وہ رپورٹ جس میں اس نے مندرجۂ صدر سکّہ غالب سے منسوب کیا ہے، دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی میں محفوظ ہے[۵]۔ جیسا کہ میں "ذکر غالب" میں بھی لکھ چکا ہوں[۶]۔ اس نے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو جو پرچہ انگریزوں کو بھیجا، اس میں بیشتر دیسی سپاہ کی سرگرمیوں کی تفصیل ہے۔ جہاں بہادر شاہ کے دربار کا ذکر ہے، وہاں لکھتا ہے:

در روز (یعنی ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء) ..... اسد اللہ خان غالب نے سکّہ زر ایک پرچہ پر لکھا، وہ یہ ہے:

بزر زد سکّۂ کشورستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

صاحب کمشنر بہادر نے ملاقات کے وقت اسی رپوٹ اور اسی سکّے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس گفتگو سے غالب کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مجھ پر سکّہ کہنے کا الزام لگا ہے۔ وہ اطمینان کہ "کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی" اب تشویش میں تبدیل ہو گیا۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو رئیس ابن رئیس اور سرکارِ انگریزی کا نمکخوار و وفادار سمجھتے تھے، لہٰذا اس طرح کا الزام ان کے نزدیک "بے وفائی اور نمکحرامی" کے مترادف تھا۔ قدرتی طور پر وہ یہ بات پسند نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے خداوندانِ نعمت انھیں شبہے کی نظر سے دیکھیں۔ اس پر انھیں فکر پیدا ہوئی۔ اِدھر اُدھر دوستوں سے ذکر کیا۔ کسی نے کہا کہ یہ سکّہ تو ذوق کا کہا ہوا ہے، جو انھوں نے ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقع پر لکھا تھا، اور اسی زمانے کے اخباروں میں شائع بھی ہوا تھا، تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، انھیں اس کا یقین آ گیا۔ کس وثوق سے چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں[۷]:

۵۔ فارن (جنرل) فروری ۱۸۶۶ء نمبر ۳۰-۳۴ (قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دلّی)

۶۔ ذکر غالب: ۱۱۰

۷۔ اردوئے معلیٰ: ۹۹

جناب چودھری صاحب! آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں تفصیل یہ کہ مولوی باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّی بہ "دہلی اردو اخبار" بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر اجانا آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں، تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں. جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکّہ ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو، بےتکلف وہ اخبار چھاپا کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں، آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اس مہینے میں یا دو ایک مہینے کے بعد سکّے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ چار مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر بمثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو، اور آپ کو اس پر علم ہو، تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہی فرمائش دور نزدیک کے متعدد اور دوستوں سے بھی کی تھی اور انھیں "دہلی اردو اخبار" کے اس شمارے کی تلاش کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ ذوالفقار الدین حیدر خان عرف ناظر حسین میرزا کو لکھتے ہیں[۸]:

بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خان نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا؛ وہاں میں نے یہ سکّہ سنا تھا۔ اون کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبرِ وفات اکبر شاہ و جلوسِ بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکّہ کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا؛ اور جلوسِ بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پرچۂ اخبار اصل بجنسہٖ مجکو بھجواؤ گے، تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا۔ ایک کاپی کو

---

۸ - علی گڑھ میگزین محوالہ نوق بناک ص ۶

لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھونگا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۵۷ء یا ۱۸۵۸ء
تین مہینوں کے بارہ پارچہ اخبار دیکھے جائیں۔ (محررہ شنبہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء)

حسین مرزا نے جواب میں لکھا ہوگا کہ تلاش جاری ہے؛ جونہی اخبار کا مطلوبہ شمارہ دستیاب ہوتا ہے، بھیجتا ہوں، تو انھیں لکھتے ہیں[9]:

وہ "دہلی اردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے، تو بہت مفید مطلب ہے؛ ورنہ خیر، کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے، حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کرینگے۔ میں نے سکہ کہا نہیں؛ اگر کہا، تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے، تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اوس کو نہ مٹا سکے۔

اسی طرح جب سرور مارہروی نے جواب دیا کہ سب طرف کوشش کی، لیکن بے سود۔ تو انھیں لکھتے ہیں[10]:

تمہاری مہربانی کا شکر بجالاتا ہوں۔ نہایت سعی یہ تھی کہ آپ کی طرف سے ظہور میں آئی۔ میں نے کلکتہ میں مہتمم مطبع "جامِ جہاں نما" کو لکھ بھیجا ہے اور ترک سعی کیا ہے، آپ بھی فکر نہ کیجیے۔ اگر کہیں سے آپ کے پاس آجائے تو مجھ کو بھیج دیجیے۔ میرے پاس آئیگا، تو میں تم کو اطلاع دے دونگا۔

گو وہ ہر طرف کوشش کرنے کے بعد مایوس ہو گئے اور انھیں مطلوبہ پرچہ کہیں سے نہ ملا؛ لیکن اس کے باوجود انھیں ابھی تک معاملے کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اسی خام خیالی میں تھے کہ زود یا بدیر جونہی حالات حسبِ سابق پُرامن ہو جاتے ہیں، میری پنشن اور دربار بحال ہو جائینگے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ حکومت ان سے ناراض ہے۔ دسمبر ۱۸۵۹ء کے اواخر میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے میرٹھ میں دربار کیا۔ دلّی کے سب درباریوں کو دربار میں شمولیت کا دعوت نامہ ملا، لیکن غالب کو پوچھا بھی نہ گیا۔ ان کے توجہ دلانے پر "جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا"[11] یہ سمجھے کہ اس سے

۹۔ اردوی معلّیٰ: ۲۴۹ (بنام یوسف میرزا)
۱۰۔ اردوی معلّیٰ: ۹۹
۱۱۔ اردوی معلّیٰ: ۲۱۱ (بنام بیخبر)

مدعا یہ ہے کہ اب مزید دعوت نامے جاری کرنے کا وقت نکل گیا ہے، اس لیے تمھیں نہیں بلایا جا سکتا۔ جب گورنر جنرل دربار سے فارغ ہو کر یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دلی پہنچے، تو غالب ان کی قیام گاہ پر گئے۔ میر منشی مولوی اظہار حسین صاحب سے ملاقات کر کے چیف سکریٹری کے پاس اپنا کارڈ بھجوایا۔ سکریٹری نے جواب دیا کہ ملنے کی "فرصت نہیں"[۱۲] اور کہا کہ "تم غدر کے دنوں میں بادشاہِ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں"[۱۳]۔ یا یہ کہا کہ[۱۴] "ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" اس وقت تو یہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلے آئے، لیکن اگلے دن انھوں نے انگریزی میں ایک درخواست لکھوا کے بھیجی کہ "باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔۔۔۔ جواب آیا۔۔۔۔ کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے"[۱۵]!

اس میں شبہہ نہیں کہ غالب "غدر" کے زمانے میں بھی قلعہ میں جاتے رہے تھے۔ فردوس مکان نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کو ۱۴ جولائی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں[۱۶]:

> در یں ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔

حسبِ معمول ان ایام میں بھی ظفر کے کلام کی اصلاح کا کام جاری رہا تھا، لیکن وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، تفتہ کو لکھتے ہیں[۱۷]:

> میں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب

۱۲۔ ایضاً : ۱۲۳؛ خطوطِ غالب : ۳۱۲

۱۳۔ اردوئے معلیٰ : ۲۱۰

۱۴۔ ایضاً : ۲۱۱

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ مکاتیبِ غالب : ۹ (متن)

۱۷۔ اردوئے معلی : ۵۸؛ خطوطِ غالب : ۳۴

میں کسی مصلحت میں مَیں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بیگناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔

وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں شاعر ہوں، مجھے سیاست سے کیا کام! میں جو کام اس سے پہلے کرتا تھا، وہی اس ہنگامے کے دوران میں بھی کرتا رہا۔ ۱۸۵۴ء سے شعر کی اصلاح کا کام میرے ذمے ہے، یہ خدمت اب بھی بجالاتا رہا۔ پہلے بھی قصیدے لکھتا تھا، اب بھی لکھتا رہا۔ چنانچہ منشی جیون لال اپنے روزنامچے[18] میں ۱۳ جولائی ۱۸۵۸ء کی یادداشت میں لکھتے ہیں[19]:

مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے انگریزوں پر فتح پانے کی خوشی میں قصائد پڑھ کر سنائے۔

ان کا یہ سکون اور اطمینان چیف سکریٹری کے مندرجۂ صدر جواب کے بعد پریشانی میں تبدیل ہو گیا۔ اب انھیں پورا احساس ہوا کہ معاملہ کس حد تک بگڑ چکا ہے اور سکّے کا جو الزام ان پر لگایا گیا ہے، اس کے اثرات کتنے دوررس ثابت ہوئے ہیں، لیکن وہ کرتے بھی تو کیا کرتے! "دہلی اردو اخبار" کے پرچے کے حصول کے لیے ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں، اور یہ کہیں سے دستیاب نہ ہوا۔ اور واقع یہ ہے کہ اگر مل بھی جاتا، تو بھی مفیدِ طلب نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ سکّہ ذوق نے کہا ہی نہیں تھا (جیسا کہ ابھی آگے آئیگا)۔ بہر حال وہ اپنی بیگناہی ثابت نہ کر سکے، اور ان کا دربار اور پنشن بند رہے۔ چودھری عبدالغفور مارہروی ہی کو لکھتے ہیں[20]:

سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب۔ کس سے کہوں! کس کو گواہ

۱۸۔ خواجہ حسن نظامی نے غدر دہلی کے افسانوں کا دسواں حصہ "غدر کی صبح شام" کے نام سے شائع کیا تھا، یہ دراصل دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہے۔ اس میں دو شخصوں کے روزنامچے شامل ہیں، جو انھوں نے غدر کے حالات سے متعلق لکھے تھے، پہلا مرزا معین الدین حسن خاں کا اور دوسرا منشی جیون لال کا۔ اوّل الذکر خاندان لوہارو کے فرد تھے۔ ان کا یہ روزنامچہ الگ سے اردو میں "خدنگِ غدر" کے عنوان سے چھپ گیا ہے۔ ناظرین کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ منشی جیون لال دادا تھے، جناب شیوراج بہادر دہلوی کے، جن کا اکتوبر ۱۹۵۷ء میں انتقال ہوا تھا۔

۱۹۔ غدر کی صبح شام: ۱۶۹ ۲۰۔ اردوی معلّیٰ: ۱۰۲

لاؤں، یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے تھے، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے، تو ذوق نے یہ دو سکّے کہ کر گزرانے، بادشاہ نے پسند کیے، مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے "دلّی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب (بھی) وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اوس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکّے سنے ہیں اور اون کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہرچند قلمرو ہند میں "دلّی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا، پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داد رست
بیداد نبود، آنچہ بما آسماں دہد

مدّت ہوئی میں قومی دفترخانۂ ہند، نئی دلّی میں کام کر رہا تھا۔ حسنِ اتفاق سے مجھے وہاں 'صادق الاخبار (دہلی)' کا ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (جلد ۴ نمبر ۱) کا شمارہ دستیاب[۲۱] ہوا۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ عبارت موجود ہے:

سکۂ نو طبع زاد جناب حافظ صاحب ویران شاگردِ رشید استاد ذوق مرحوم

بزر زد سکۂ کشورستانی سراج الدیں بہادر شاہ ثانی

اس سے ثابت ہوا کہ گوری شنکر مخبر نے جو اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ غالب نے یہ سکّہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے حضور گزرانا، تو یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ یہ سکّہ غالب نے نہیں، بلکہ حافظ غلام رسول ویران تلمیذ ذوق نے کہا تھا۔ دوسرے یہ کہ ویران بھی اسے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) سے، جو صادق الاخبار کے اس شمارے کی تاریخ اشاعت ہے، پہلے ظفر کی خدمت میں پیش کر چکے تھے، جبھی تو یہ صادق الاخبار میں شائع ہوا۔ یہ اخبار قلعہ کی سرپرستی میں چھپتا تھا اور قلعہ کی خبریں چھاپنا اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس صورت میں غالب کا اس سکّے کو ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو ظفر کے حضور پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا!

۲۱- غدر کے اخبارات: صادق الاخبار (ذخیرہ ۴-۶)

بدقسمتی سے نہ غالب کو اس کا علم تھا، نہ ان کے کسی دوست کو؛ اور چونکہ وہ مخبر کے عائد کردہ اتہام کو غلط نہ ثابت کر سکے، اس لیے یہ جرم گویا ثابت ہو گیا۔ سزا کے طور پر ان کی پنشن بھی بند ہو گئی، اور دربار و خلعت کا اعزاز بھی چھن گیا۔ پھر اگرچہ پنشن دوبارہ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوئی اور دربار کا اعزاز ۱۸۶۳ء میں بحال ہوا، تو حقیقۃً یہ ان سے رعایت کی گئی تھی۔ دراصل یہ نتیجہ تھا نواب صاحب رامپور اور دوسرے اصحاب کی مساعی کا۔ ورنہ ہے یوں کہ حکومت نے انھیں ان کی اس فرضی لغزش کے لیے کبھی معاف نہیں کیا۔ مثلاً ۱۸۶۵ء میں انھوں نے حکومت کے سامنے تین مطالبے رکھے[۲۲]: (۱) مجھے ملکۂ معظمہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے؛ (۲) دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا ہو؛ اور (۳) حکومت میری کتاب دستنبو اپنے خرچ پر شائع کرے، تو اس پر حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر کے زمانے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ اس پر یہی بدبخت رپوٹ پھر برآمد ہوئی، جس میں یہ سکّہ ان سے منسوب تھا۔ چنانچہ حکومت نے ان کی سب درخواستیں رد کر دیں۔

بسا اوقات چھوٹے بیج سے بڑا درخت پیدا ہوتا ہے۔

۲۲- قومی دفتر خانۂ ہند۔ فارن، ستمبر ۱۸۶۵ء (۷۳-۷۵)؛ نیز دیکھیے ذکرِ غالب: ۱۲۱-۱۲۶

غالب سے منسوب دوسرا سکّہ

میں لکھ چکا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے غالب پر جو الزام لگایا تھا کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے لیے یہ سکہ کہا تھا :

بزر زد سکۂ کشور ستانی   سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

تو یہ غلط تھا ، یہ سکہ دراصل حافظ غلام رسول ویران تلمیذِ ذوق مرحوم نے لکھا تھا ، اور مخبر نے ویران کا کارنامہ خواہ مخواہ غالب کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا۔ اسی دوران میں ایک اور سکہ منظرِ عام پر آیا ، جو منشی جیون لال نے غالب سے منسوب کیا تھا ، اور جس کا ذکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے[1]۔ منشی جیون لال کے لفظ یہ ہیں :

دیگر سکہ شعر۔ مرزا نوشہ ؎

بزرِ آفتاب و نقرۂ ماہ   سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

یہ منشی جیون لال ماتھر کایستھ ، کمشنر دہلی کے دفتر میں ملازم تھے اور غالباً وہاں فارسی خط و کتابت ان سے متعلق تھی ۔ غالب کے ایک خط موسومہ میر مہدی مجروح میں بھی ان کا نام آیا ہے[2]۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے اور دلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد بھی وہ انگریزی حکومت کے ملازم رہے۔ جب مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہ میرٹھ سے آ کے دلی پر قابض ہو گئی ، تو یہ بیکار ہو گئے۔ ان ایام میں وہ یہ روزنامچہ لکھتے رہے ، جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون میں ہے[3]۔ بہرحال دلی والے جانتے تھے کہ وہ انگریز کمشنر کے دفتر کے ملازم ہیں ۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ ہنگامے کے دنوں میں قلعہ میں بار پا سکے ہوں ، بلکہ اگر وہ اس کی کوشش کرتے ، تو قدرتی طور پر لوگ انھیں شک و شبہہ کی نظر سے

۱۔ معارف (اعظم گڈھ) ، نومبر ۱۹۵۸ء : ۳۹۳

۲۔ اردوئے معلیٰ : ۱۲۹ ؛ خطوطِ غالب : ۳۰۰

۳۔ اسی روزنامچے کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غدر کی صبح شام" کے نام سے شائع کیا تھا ۔

دیکھتے اور ان کی جان معرضِ خطر میں آجاتی۔ انھوں نے یہ روزنامچہ انگریزوں ہی کے لیے لکھا تھا۔ ان کے اسے مٹکاف کی خدمت میں پیش کرنے ہی سے ان کا مقصد ظاہر ہے۔ میری نظر میں گوری شنکر اور جیون لال میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر انگریزوں کا تنخواہ دار ملازم تھا، اور یہ غالباً تنخواہ نہیں لیتے تھے؛ ورنہ انگریزوں کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھنے میں دونوں کی خدمات یکساں ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی یہی بات زرا زیادہ صراحت سے لکھی ہے[4]۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ منشی جیون لال نے جو سکہ غالب کے نام سے لکھا ہے، یہ ان کی اپنی دید یا شنید تو ہو نہیں سکتی۔ غالباً کسی نے ان سے اسی طرح بیان کیا اور انھوں نے یہ لکھ دیا۔ اور اس معاملے میں ہم گوری شنکر کی کارگزاری دیکھ ہی چکے ہیں، جو اپنی آنکھوں دیکھی بیان کرنے کا مدّعی ہے۔ پس اس صورت میں ہم جیون لال پر گوری شنکر سے زیادہ بھروسا کس طرح کر سکتے ہیں؟ اسی لیے میرے خیال میں یہ دوسرا سکہ بھی غالب کا نہیں۔ وہ خود بھی اس سے انکاری ہیں، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں[5]:

> میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا، تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا؛ یہ گناہ نہیں۔

یہاں ان کا اصلی بیان یہ ہے کہ "میں نے سکہ کہا نہیں"۔ منطق اور قانونی پہلو سے مابعد کی شرط محض بفرضِ محال ہے، جو بدرجۂ مجبوری بیان ہوئی ہے؛ اس لیے اس سے استدلال درست نہیں ہوگا۔ اگر انھوں نے یہ دوسرا سکہ کہا ہوتا تو یہ مطالبہ نہ کرتے کہ[6]:

> یا غیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔

اگر ان کے دل میں اس دوسرے سکے کا چور ہوتا، تو وہ کبھی اس بیباکی اور تحدّی سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے، کیونکہ جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گوری شنکر والا سکہ ان کا کہا ہوا نہیں، وہیں یہ بھی عین ممکن تھا کہ تحقیقات کے دوران میں یہ دوسرا جیون لال والا سکہ برآمد ہو جاتا۔ لوگوں نے بہادر شاہ کے مقدمے میں کس کس طرح سے ان کے خلاف گواہیاں دی تھیں! جیون لال کے بیان کے مطابق غالب نے یہ سکہ سرِ دربار پیش کیا تھا، اگر پوچھ گچھ ہوتی، تو کیا کوئی

۴۔ نقشِ آزاد: ۳۰۴ (حاشیہ) نیز دیکھیے "غالب" (از مہر)؛ ۳۱۷-۳۱۸

۵۔ اردوے معلی: ۲۴۹؛ خطوطِ غالب: ۲۱۸

۶۔ اردوے معلی: ۲۱۱ (بنام بیخبر)

ان کے خلاف شہادت نہ دیتا؟ اس پر "صفائی اور بیگناہی" تو کیا ثابت ہوتی، اور لینے کے دینے پڑجاتے۔ اگر انھوں نے واقعی یہ سکہ کہا ہوتا، تو ان کا یہ مطالبہ آگ سے کھیلنے کے مرادف تھا۔ غالب کی دنیوی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بات خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ یہ خطرہ مول لیا ہو۔ اسی لیے میرا یقین ہے کہ یہ دوسرا سکہ بھی ان کا کہا ہوا نہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ سکہ

> خود پکار پکار (کر) کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا؛ اور میرے دریافت کیے ہوئے شعر (بہ زرِ آفتاب ا لخ) کا خوبصورت انداز غالب کے طرزِ اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔ اب تک سات سکے سامنے آئے ہیں، لیکن اس "قدرِ دلکش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔[۸]

خدا معلوم ان کا مدعا کیا ہے! کیا "طرزِ اسلوب" (؟) سے ان کی مراد یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں زر و سیم کی جو تشبیہیں سورج اور چاند سے دی گئی ہیں، یہ غالب کے سوا کسی دوسرے کو نہیں سوجھ سکتی تھیں! ظاہرا کوئی اور بات تو اس سکے میں قابلِ ذکر ہے نہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ فارسی شاعری میں ازل سے ہوتا آیا ہے؛ غالب پہلے شاعر نہیں، جنھوں نے یہ تشبیہیں لکھی ہوں۔ اور سکوں کے لیے تو یہ اتنی سامنے کی چیز ہے کہ تقریباً ہر موقع پر سونے چاندی کے سکوں کے لیے مہر و ماہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خاندانِ تیموریہ ہی کے بعض بادشاہوں کے سکے ملاحظہ کیجیے:

اورنگ زیب عالمگیر:

چاندی کا سکہ:	سکہ زد در جہاں چو بدرِ منیر	شاہِ اورنگ زیبِ عالم گیر
سونے کی اشرفی:	سکہ زد در جہاں چو مہرِ منیر	شاہِ اورنگ زیبِ عالم گیر
جہاندار شاہ:	بزد سکہ در ملک چوں مہر و ماہ	شہنشاہِ غازی جہاندار شاہ

محمد شاہ (رنگیلا): ز فضلِ حق شہنشاہِ محمد شاہِ دیں پرور
دریں عالم زدہ سکہ ز مہر و ماہ روشن تر

اسی سلسلے میں صادق الاخبار کا ایک اور اقتباس بھی درج کرتا ہوں، جو دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

۷- معارف، نومبر ۱۹۵۸ء: ۳۹۴

۸- ایضاً، ۷ مئی ۱۹۵۹ء: ۳۹۶

لکھا ہے[9]:

سکہ ہائے شاہی از طبعِ عالیِ عرفیِ زماں، خاقانیِ دوراں، فیضیِ وقت مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانیدار، رئیسِ دادری

۱- سکہ زد در جہاں بعونِ الاہ — حامیِ دینِ حق بہادر شاہ

(ان دونوں مصرعوں سے تاریخ ہجری ۱۲۷۳ برآمد ہوتی ہے، مگر ملفوظی)

۲- شرق و غرب زدہ سکہ ہمچو مہر ز ماہ — ابوظفر شہِ عالی نسب بہادر شاہ

۳- بدہر سکہ شاہی زدہ بہادر شاہ — بحقِ اشہدان لا إلٰہ الا اللہ

۴- بدہر سکہ شاہی زدہ بفضل إلٰہ — ابوظفر شہِ گیتی ستاں بہادر شاہ

مدیر اخبار نے ان سکوں پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

یوں تو سب سکے خوب ہیں، مگر جناب مولانا صاحب نے سکہ تاریخی میں کمال کیا ہے اور جس سکہ میں ذکرِ کلمہ ہے، وہ بھی خالی از برکت نہیں۔

یہاں بھی دوسرے شعر میں زر و سیم کی مناسبت سے مہر و ماہ کی تشبیہ موجود ہے۔
بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ منشی جیون لال نے بھی سنی سنائی بات پر یقین کر کے یہ سکہ غالب کے نام لکھ دیا، یہ غالب کا کہا ہوا نہیں، ورنہ وہ کبھی انگریزوں سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے[10]

۹- صادق الاخبار، دلی شمارہ ۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ (۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء): ۴

۱۰- یہاں ضمناً ایک بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا:
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اسی محولۂ فوق مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

یہاں ایک جملۂ معترضہ ضروری ہے۔ مٹکاف نے "خدنگِ غدر" کے انگریزی ترجمہ میں سورج الدین لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ترجمہ کی بیشمار غلطیاں ہیں۔ (معارف، نومبر ۱۹۵۸ء: ۳۹۱-۳۹۲)

ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ مترجم نے "سورج الدین" نہیں، "سراج الدین" (بفتحۂ سین) لکھا ہے۔ (بکسرِ سین کی جگہ)۔ شروع میں انگریزی فتحہ کی جگہ اکثر انگریزی حرف "یو" (U) لکھتے رہے۔ غالباً موصوف کو اس زمانے کی انگریزی مطبوعات یا مسودات دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا؛ یا انھوں نے غور نہیں کیا؛ ان میں ہندستانی ناموں کے انگریزی ہجوں میں اکثر یہی صورت ہے۔ ہمارے بعض شہروں کے ناموں میں آج تک اس کے آثار موجود ہیں (مثلاً پنجاب، جالندھر، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ)۔ انھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ابتدائی دور کی بعض سرکاری دستاویزوں میں غالب کا نام (اسد اللہ خان) اور ان کے چچا (نصر اللہ بیگ خان) کا نام بھی 'یو' (U) سے شروع کیے گئے ہیں۔

۲

لیکن غضب تو ڈاکٹر خلیق انجم نے کیا ہے کہ محض قیاس آرائی سے ایک اور سکّہ غالب سے منسوب کر دیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے پاس کم از کم، منشی جیون لال کی شہادت پڑھو لاکھ کمزور سہی، ایک سکّہ موجود تو تھا، جو غالب کے سر تھوپا گیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے محض قیاس سے کام لے کر، خدا معلوم کس کا کہا ہوا سکّہ، غالب سے منسوب کر دیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے ایک خط کی بنا پر (اور ان کا خیال ہے کہ اس خط کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی) یہ دعویٰ کیا ہے کہ غالب پر ایک سکّے کا نہیں، دو سکّوں کا الزام تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے غالب کا یہ خط بطور ثبوت پیش کیا ہے[۱۱]:

> سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا، جیسے کوئی چھرا یا کوئی گرداب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں:
> یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے، تو ذوق نے دو سکّے کہہ گزرانے، بادشاہ نے پسند کیے، مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلّی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ، اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اوس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سنے، اور اون کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب پر دو سکّوں کا الزام تھا، اور وہ اس سے اپنی برأت ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ اس خط کا پس منظر اُسی پہلے سکّے میں مضمر ہے، جس کا پچھلے مضمون میں بیان ہوا ہے۔

غالب جب غدر کے بعد دلّی کے کمشنر سے ملاقات کے لیے گئے ہیں، تو صاحب بہادر نے صاف کہا تھا کہ آپ پر یہ سکّہ کہنے کا الزام ہے[۱۲]۔

غالب اور شاہانِ تیموریہ : ۱۰۹

۱۱۔ عودِ ہندی : ۳۰۔۳۱ (عبدالغفور سرور)

۱۲۔ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) : بلاک ص ۵ (مقابل ص ۸۷)

بہ زر زد سکۂ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

بعد کو میر احمد حسین نے انھیں بتایا کہ یہ سکہ تو ذوق نے بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقع پر کہا تھا۔ اسی محولۂ فوق مکتوب میں حسین میرزا کو لکھتے ہیں[۱۳]:

بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں۔ نے یہ سکہ سنا تھا۔ اون کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبرِ وفاتِ اکبر شاہ و جلوسِ بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکہ کا گزرنا، ذوق کی طرف سے چھاپا تھا...... بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے، اور وہ پرچۂ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے، تو بڑا کام کرو گے۔

آپ نے دیکھا کہ چودھری عبدالغفور کے خط میں بھی انھوں نے مرشد آباد کا نام لیا؛ اور یہاں بھی میر احمد حسین کی زبانی کہا ہے کہ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ سکہ انھوں نے مرشد آباد میں سنا تھا۔ دراصل ان سے مرشد آباد کی بات کسی اور نے نہیں، صرف میر احمد حسین نے کہی تھی جسے انھوں نے عمومیت کا رنگ دے کر "اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اوس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور اون کو یاد ہیں" کہہ دیا۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ میر احمد حسین نے ان سے پہلی مرتبہ ہی ذوق کے دو سکوں کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ صاحب کمشنر بہادر نے ابھی تازہ تازہ ان سے ایک سکے کا ذکر کیا تھا، اس لیے حسین میرزا کو خط لکھتے ہوئے انھوں نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اسی ایک سکے کی بات کی اور اخبار تلاش کر کے بھیجنے کو کہا۔ میر احمد حسین نے دو سکوں کا بتایا تھا، اس کا ثبوت موجود ہے۔

دلی اردو اخبار کے اس پرچے کے لیے انھوں نے "اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا" تھا، اور شاید کالپی بھی۔ پہلے تمام خط انھوں نے حسین میرزا والے خط کے ساتھ ہی لکھے تھے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں[۱۴]:

جناب چودھری صاحب! آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ ہے کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا

۱۳۔ ایضاً : بلاک ص ۶

۱۴۔ عودِ ہندی : ۲۴

مسمیٰ بہ دہلی اردو اخبار۔ بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یہاں یا کسی آپ کے دوست کے یہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں، تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکے ان کے نام کے کہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو، بےتکلف وہ اخبار چھاپہ کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں، اور ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے کے بعد سکے کہہ کر گزرانے ہیں۔

اس موضوع پر چودھری عبدالغفور کے نام یہ ان کا پہلا خط ہے، اور اس میں دو سکّوں کا ذکر ہے۔ اور یہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ اس کی اطلاع انھیں میر احمد حسین نے دی تھی۔ بعد کو جب معاملہ ختم ہونے کو آیا، اور اس دوران میں وہ کہیں سے مطلوبہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ بھی حاصل نہ کر سکے، تو دوبارہ اسی کے بارے میں عبدالغفور کو لکھتے ہوئے انھوں نے دو سکّوں کا لکھ دیا، حال آں کہ نہ شروع میں ان پر دو سکّوں کا الزام تھا، نہ بعد کو کسی نے ان سے دو سکّوں کی بات کی؛ وہی میر احمد حسین کی کہی ہوئی بات ان کے تحت شعور سے ابھر کر زبانِ قلم پر آگئی۔

بس، حقیقت یہ ہے کہ دوسرے سکّے کا کبھی کوئی الزام تھا ہی نہیں، نہ اس سے متعلق کوئی شہادت تھی۔ گوری شنکر نے ایک ہی سکّے کے بارے میں لکھا تھا، اسی کے لیے بازپرس ہوئی، اور اسی کا الزام آخر تک ان پر قائم رہا۔

اس کی شہادت ایک اور بات سے بھی ملتی ہے:

غدر کے بعد اسی سکّے کے الزام میں ان کا دربار کا اعزاز چھن گیا اور پنشن بھی بند ہو گئی۔ برسوں کی دوڑ دھوپ سے، خدا خدا کر کے یہ دونوں قضیے ان کے حق میں طے ہو گئے، تو انھوں نے ۱۸۶۵ء میں دوبارہ گورنر جنرل کی خدمت میں اپنی پرانی درخواست پیش کی کہ (۱) مجھے حضرت ملکۂ معظمہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے، اور (۲) سرکاری درباروں میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے۔ اب کے انھوں نے ایک اور شق کا اضافہ کر دیا کہ حکومت میری کتاب دستنبو بھی اپنے خرچ پر شائع کرے۔ گورنر جنرل کے دفتر سے یہ درخواست حکومتِ پنجاب کو بھیج دی گئی، جس کے حیطۂ اقتدار میں اس وقت دلّی کا علاقہ تھا کہ وہ اس کے بارے میں اپنی رائے اور سفارش پیش کریں۔ حکومتِ پنجاب نے ان کا پرانا ریکارڈ طلب کیا، تاکہ معلوم ہو سکے کہ غدر کے دنوں میں ان کا "چال چلن" کیسا رہا تھا؛ دفتروں میں تو

فائل ہوتے ہیں۔ ان کا فائل پیش ہوا، تو اس میں سے وہی گوری شنکر کا بھیجا ہوا سکہ برآمد ہوا، اور دلی کے کمشنر کی رپورٹ بھی۔ غرض اس وقت بھی وہی سکہ نکلا، جو ان کے خلاف الزام کی بنیاد تھا؛ کسی دوسرے سکے کا پتا نشان نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایسا کوئی الزام تھا ہی نہیں، تو نکلتا کہاں سے[15]!

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں[16]:

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دورانِ غدر میں غالب نے کم از کم دو قصیدے ظفر کی مدح میں پڑھے تھے۔ عبداللطیف نے ۲۵ مئی کے تحت لکھا ہے:

ٹکسال کا کام منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد کیا گیا..... اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا، اور تیزی سے سکہ بننا شروع ہوا۔ سکہ کا چہرہ اس طرح روشن ہوا:

سکہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ

شاہِ ہندوستان بہادر شاہ

عبداللطیف نے اس سکے کے مصنف کا نام نہیں بتایا۔ میرا قیاس ہے کہ یہی سکہ غالب کا کہا ہوا ہے۔ اگرچہ غدر کے زمانے میں کئی لوگوں نے سکے کہے تھے لیکن جو روپے دلی میں تیار ہوتے تھے، ان پر غالب کے علاوہ کسی اور کا سکہ کہا جانا قرینِ قیاس نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے قیاس کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ لیکن جب اساسی طور پر ان کا دو سکوں کا نظریہ ہی درست نہیں، تو ان قیاس آرائیوں کی ضرورت ہی کیا ہے!

غالب نے جو یوسف میرزا کو لکھا ہے کہ "میں نے سکہ کہا نہیں؛ اور کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا" تو اس پر لکھتے ہیں[17]:

غالب کا یہ کہنا کہ "(اول تو) میں نے سکہ کہا نہیں" ہرگز درخورِ اعتنا نہیں۔ غالب ایسے معاملوں میں مستقل دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔

موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ درشت کلامی اور سخت زبانی اور استہزا نہ دلیل و حجت کی جگہ لے سکتے ہیں، نہ اسے تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ ہماری غالب کے خلاف یہی تو شکایت ہے کہ انھوں نے موقف برہانِ قاطع کے لیے تمسخر اور توہین کا لہجہ اختیار کیا۔

۱۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ذکرِ غالب: ۱۲۱-۱۲۶

۱۶۔ غالب اور شاہانِ تیموریہ: ۱۱۱-۱۱۲ ۱۷۔ ایضاً: ۱۱۰

دربار رام پور سے تعلقات

کیا نیک گھڑی تھی وہ، جب ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو میرزا غالب نے، مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک پر، فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خان والیِ رام پور کی خدمت میں قصیدۂ مدحیہ بھیجا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی ان دنوں رام پور ہی میں تھے۔ انھوں نے یہاں پہلے سے زمین ہموار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب میرزا کا قصیدہ نواب فردوس مکان کی خدمت میں پہنچا، تو مولانا نے بطرزِ مناسب تقریب کی اور نواب صاحب نے ان کی سفارش پر غالب کی شاگردی کا فیصلہ کر لیا حال آنکہ بقول ان کے انھوں نے اس سے پہلے کبھی ایک شعر تک نہیں کہا تھا۔ میرزا کو قصیدے کی رسید اور ان کی شاگردی اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

> میرے مشفق! مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن محض مولوی فضل حق موصوف کی زبانی، آپ کا بلند پایہ کلام سننے سے دل چاہا کہ کسی طرح آپ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ چونکہ اس کے لیے اس سے بہتر کوئی سبیل میری سمجھ میں نہیں آئی، اس لیے میں نے چند شعر غلط سلط موزوں کیے ہیں، امیدوار ہوں کہ ان غزلوں کی اصلاح اور جدید مصرعِ طرح تجویز کرنے کی زحمت گوارا فرمائینگے۔ چونکہ ایسے موقع پر شیرینی پیش کرنے کا دستور ہے، لہٰذا ڈھائی سو روپیہ کی ہنڈوی بتقریبِ شیرینی اس خط میں ملفوف پہنچتی ہے۔ براہِ کرم اُسے قبول فرمائیں اور اس کے پہنچنے کی اطلاع بخشیں؛ اور اس مخلص کو اپنا خیراندیش تصور

۱۔ مکاتیب غالب (مرتبہ عرشی)، حواشی: ۱۲۰ (بار پنجم ۱۹۴۷ء)

کرتے ہوئے، اپنی خیریت کی خبر سے جلد جلد، عبارتِ سلیس میں، جس کے سمجھنے میں تکلف نہ ہو، مسرور و مطمئن فرماتے رہا کریں۔ (آزاد ترجمہ) (۵ فروری ۱۸۵۷ء)

یہ خط دنیائے ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شاید ہی کبھی کسی والیِ ریاست نے کسی شاعر کی شاگردی، اختیار کرتے ہوئے ایسے نیاز مندانہ خیالات کا اظہار کیا ہو۔ اس خط سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اپنے زمانے میں کتنی قدر ہوئی، اور ان کے دوسرے دوستوں کی طرح مولانا فضل حق نے بھی کس حد تک حقِ دوستی ادا کیا، وہیں اس سے نواب فردوس مکان کی تواضع اور انکسار، بلند نظری اور بزرگداشت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ میرزا کے ساتھ ان کا آخر تک یہی رویہ رہا۔

غرض کہ اس دن سے نواب فردوس مکان، میرزا کے شاگرد ہو گئے۔ ناظم تخلص ہوا۔ کوئی تنخواہ نہیں مقرر ہوئی تھی۔ نواب صاحب جب چاہتے، کسی بہانے کچھ بھیج دیتے۔ چنانچہ اس پہلے خط ہی کے ساتھ ڈھائی سو شیرینی کے بھیجے ہیں۔ اگلے مہینے مارچ میں پھر ڈھائی سو تبرید کے نام سے بھیج دیے[۲]۔ پھر جولائی اور اگست میں ڈھائی ڈھائی سو بطور امداد عنایت فرمائے[۳]۔ اسی طرح وہ جب چاہتے، اپنے آپ، یا خود میرزا صاحب کی درخواست پر بھیجتے رہتے تھے۔

میرزا کو سرکارِ انگریزی سے ساڑھے باسٹھ ماہانہ پنشن کے ملتے تھے۔ قلعے سے بھی پچاس روپیہ مہینا ملتا تھا۔ اِدھر اُدھر سے بھی کچھ فتوح آجاتی تھی۔ اس لیے اگر حالات معمولی رہتے، تو رام پور کی اس گاہے ماہے کی امداد کو ملا کر وہ آسانی سے گھر کا اُجلا خرچ چلا سکتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے، نواب فردوس مکان کی شاگردی کے تھوڑے ہی دن بعد، مئی ۱۸۵۷ء میں ہندستان کی تاریخ کا وہ مشہور ہنگامہ برپا ہوا، جسے "غدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی پنشن بند ہو گئی، قلعے کے پچاس بھی بند ہو گئے، دائیں بائیں کی دوسری فتوحات بھی بند ہو گئیں۔ دوسرے لفظوں میں لے دے کے ان کے پاس ایک رام پور کا سہارا رہ گیا۔ اب صورتِ حال ایسی تھی کہ انھیں جسم و جان کو یکجا رکھنے کے لیے باقاعدہ اور مستقل آمدنی کی ضرورت تھی۔

بہت دن تک وہ پریشان حال ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ نواب فردوس مکان نے بھی دو تین بار امداد فرمائی لیکن جب حالت بہت پست ہو گئی، تو انھوں نے ۱۰ جولائی ۱۸۵۹ء کو اپنے گرامی قدر شاگرد کی خدمت میں لکھا[۴]۔ کہ میرا ہاتھ پتھر تلے دب گیا ہے، سخت زیر بار اور مجبور ہو گیا

۲- ایضاً، دیباچہ : ۱۳۵

۳- ایضاً : ۱۳۵-۱۳۶

۴- ایضاً : ۸۲

ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرا مستقل وظیفہ مقرر کر کے دستگیری فرمائی جائے۔ استاد نواز اور قدردان شاگرد نے فوراً جواب دیا کہ" اس [5] مہینے جولائی سے سو روپیہ مہینا مقرر کیا گیا اور دفتر میں آپ کا نام مندرج کیا گیا"۔

نواب فردوس مکان سے غالب کے تعلقات آخر تک بے تکلفانہ رہے۔ تنخواہ کے ایک سو تو ہر مہینے آتے ہی تھے، اس کے علاوہ بھی کسی تقریب یا ضرورت سے کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ جولائی ۱۸۵۹ء میں تنخواہ مقرر ہو گئی تھی، اس کے باوجود ۸ دسمبر کو جب انھیں نومبر کی تنخواہ موصول ہوئی تو انھوں نے رسید بھیجتے ہوئے لکھا:[6]

آداب نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپے کی ہنڈوی بابت مصارفِ ماہِ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی، اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں، تو کس سے کہوں! اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو بھیج دیجیے گا، تو جلا لیجیے گا، لیکن اس شرط سے کہ عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔

یہ خط جس بے تکلفی سے لکھا گیا ہے، وہ اس کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ جواب میں بلا تاخیر نواب صاحب نے دو سو روپے کی ہنڈوی بھیج دی اور ساتھ ہی انھیں پانچویں بار رام پور آنے کی دعوت دی۔ میرزا صاحب تو یہاں مالی مشکلات سے گھبرا ہی رہے تھے۔ اس خط کے ملنے کے بعد رام پور روانہ ہو گئے اور دو مہینے وہاں رہ کے مارچ ۱۸۶۰ء میں واپس دلی آئے۔[7]

اسی طرح اکتوبر ۱۸۶۳ء میں نواب صاحب نے اپنے آپ بے طلب دو سو روپے بطورِ امداد ارسال فرمائے۔[8] میرزا نے پوچھا کہ کہیں یہ رقم تنخواہ میں سے پیشگی تو عطا نہیں ہوئی۔ نواب فردوس مکان نے جواب دیا:[9]

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، متن: ۱۷

۷۔ ذکر غالب: ۱۱۳-۱۱۴

۸۔ مکاتیب غالب، دیباچہ: ۱۳۶

۹۔ ایضاً: ۱۳۷

یہ دوسو روپیہ تنخواہ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ آپ شوق سے صرف کیجیے۔ تنخواہ موافق معمول کے پہنچ جائیگی۔ یہ علاوہ تنخواہ سے ہیں۔

ایک موقع پر کسی بات سے میرزا صاحب کو شبہہ ہوا کہ نواب فردوس مکان کے رویّے میں وہ پہلی سی بے تکلفی اور بیباختگی نہیں رہی، شاید کسی سبب سے ناراض ہیں۔ جب میرزا نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا، تو دیکھیے، نواب صاحب کس گرمجوشی اور فراخدلی سے جواب دیتے ہیں[11]:

جو کہ آپ خفا ہونا مخلص کا، بسبب عدم رسیِ رقائم اخلاص، محتوی رسیداتِ صحائفِ موصوفہ اپنے، تحریر فرماتے ہیں، اے حضرت، مخلصِ صمیم تو آپ کو بزرگ اور عنایت فرما اپنا جانتا ہے۔ توقف رسیِ رقائم نیازکی باعثِ خفگی نہ تصور فرمائیے

نواب فردوس مکان سے میرزا کے جو مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے، ان کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ میرزا نے غدر سے پہلے مارچ اور اپریل ۱۸۵۷ء میں، بعض ایسے رازدارانہ خطوط نواب صاحب کی خدمت میں لکھے، جو بگمانِ غالب سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ چونکہ غالب نے لکھنے کے ساتھ ہی درخواست کی تھی کہ یہ خط پڑھتے ہی چاک کر دیے جائیں، اس لیے یہ محفوظ نہ رہے اور ان کی تفصیلات ہم سے مخفی رہ گئیں لیکن جس زمانے میں یہ تحریر ہوئے ہیں، اور میرزا صاحب کی یہ تاکید کہ انھیں ضائع کر دیا جائے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لازماً ان میں میرزا نے قلعے کے حالات، رعایا کی بےچینی اور انگریزی سیاست سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر کے، نواب صاحب کی خدمت میں مشورہ پیش کیا ہوگا۔ چونکہ یہ زمانہ حد درجہ سیاسی بے اطمینانی اور افراتفری کا تھا اور معلوم نہیں تھا کہ حالات کیا پلٹا کھائینگے، اس لیے میرزا نے سوچا ہوگا کہ کہیں یہ تحریریں کسی مخالف کے ہاتھ نہ لگ جائیں اور انجامِ کار مصیبت کا باعث ہوں، اس لیے ان کا ضائع کر دینا مناسب ہے۔ چنانچہ نواب صاحب نے غالب کے مشورے کے مطابق انھیں پڑھ کے چاک کر دیا[12]

۱۰۔ ایضاً، متن: ۲۳

۱۱۔ ایضاً، دیباچہ: ۱۳۴

۱۲۔ ایضاً، متن: ۶-۷، نیز دیباچہ: ۸۰

یہ دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات، نواب فردوس مکان کی زندگی بھر قائم رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نواب صاحب انھیں آموں کی بہنگیاں تحفۃً بھیج رہے ہیں[۱۳]۔ انھیں زگتروں یا چوب چینی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو میرزا صاحب کو فرمایش ہوتی ہے کہ دلی سے زگترے اور چوب چینی خرید کر روانہ کی جائے[۱۴]۔ گو یہ بظاہر معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن یہی تعلقات کی قربت اور یگانگت کی بیّن دلیل ہیں۔ اسی باعث میرزا جیسے حسّاس طبع شخص کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ملازم ہیں، اور ان کا شاگرد اتنا بلند مرتبہ ہے کہ وہ اس کے قریب تک نہیں جا سکتے۔ اسی بات کو وہ ایک دوسرے پیرایے میں رام پور سے واپسی پر میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں[۱۵]:

> قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں، تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ بحالی۔ سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں؛ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔

نواب صاحب نے کس طرح اپنے استاد کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ اور اس کی خوشی اور غمی کو اپنی خوشی اور غمی خیال کیا، اس کا اظہار نمایاں طور پر ان کے ایک خط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے غدر کے بعد میرزا کی پنشن کی بحالی پر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں[۱۶]:

> مشفقا! جب کوئی مسرت پیش آنے والی ہوتی ہے، تو آغاز ہی سے مقدماتِ سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سامان نظر آتے ہیں، کہ بے اختیار دل کو انبساط، طبیعت کو نشاط ہو۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ ۱۹ تاریخ اپریل سنہ حال، پہلے تو ایک لاکھ بیس ہزار کی جاگیر پر دخل دہانی کا خریطہ آیا۔ میں اسے پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کا نامہ

۱۳۔ ایضاً، متن: ۲۶

۱۴۔ ایضاً: ۲۹-۳۰؛ نیز ایضاً، دیباچہ: ۱۳۱

۱۵۔ خطوطِ غالب (مالک رام): ۳۱۳-۳۱۴

۱۶۔ مکاتیبِ غالب، حواشی: ۱۳۵

سرور افزا آیا۔ اس سے آپ کی پنشن کی بحالی کا مژدہ پایا۔ نشۂ سرور دوبالا ہوگیا اور اس قدر بالیدگی اور خوشی حاصل ہوئی کہ زینہار بیان اس کا مجالِ زبان وقلم نہیں۔ بارِ خدایا! مبارک ہو۔ سپاسِ منعمِ حقیقی ادا نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میں بلا نقصان پنشن کا جاری ہونا، محض شانِ قدرتِ باری ہے۔ شکر اس کے احسانات کا کہاں تک کیجے۔ عجب قدرت نمائی فرمائی ہے۔ دل کو شگفتہ مسرت ہاتھ آئی ہے۔

(۲۰ اپریل ۱۸۶۰ء)

نواب فردوس مکان نے قضائے الٰہی سے اپریل ۱۸۶۵ء میں بعارضۂ سرطان انتقال کیا اور ان کی جگہ ان کے فرزندِ اکبر خلد آشیان، نواب کلب علی خان بہادر، رام پور کی گدی پر جلوہ افروز ہوئے۔ نواب کلب علی خان کی تعلیم بہت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی۔ وہ علمی استعداد میں اپنے اقران و اماثل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ مزاج میں مذہبیت بدرجۂ کمال تھی، بلکہ اگر کہا جائے کہ اس میں غلو اور تقشّف کا رنگ آگیا تھا، تو شاید اسے مبالغہ پر نہ محمول کیا جائے۔ بقول مولانا عرشی[۱۷] "وہ آپ بڑے حاتم دل، پابندِ شرع، بامروت اور خلیق تھے۔ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے اور غیر شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے"۔

میرزا کو اس تبدیلی سے قدرتاً اپنے وظیفے کی فکر ہوئی، لیکن جب انھوں نے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں نواب فردوس مکان کی تعزیت کا خط لکھا، تو انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ[۱۸] "جو مشاہرہ آپ کا حضرت نواب صاحب قبلہ کے عہد سے مقرر ہے، وہ انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری رہیگا" اس پر انھیں اطمینان ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے قصیدۂ تہنیت بھیجا۔ اسی دوران میں میرزا داغ رام پور سے دلی آئے، تو میرزا نے ملاقات کے دوران میں ان سے ذکر کیا کہ میں عنقریب رام پور آنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ جب نواب صاحب نے قصیدے کی رسید لکھی، تو اسی خط میں اس سے متعلق رقم فرمایا[۱۹]:

نواب مرزا کی زبانی آپ کے اس طرف آنے کے قصد کا حال معلوم ہوا۔ اس سے

۱۷۔ ایضاً، متن: ۳۴

۱۸۔ ایضاً، حواشی: ۱۴۸

۱۹۔ ایضاً: ۱۵۰

کمال مسرت ہوئی۔ راقم بھی آپ کی ملاقاتِ شریف کا متمنّی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس فراق کی اندھیری رات کو جلد ایامِ وصال میں تبدیل کر دے۔

(۱۱ جون ۱۸۶۵ء)

اس پر میرزا نے جواب دیا:[۲۰]

حضرت کی خدمت میں نہ آؤنگا تو اور کہاں جاؤنگا۔ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسیگا۔ سفر، خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو، دونوں صورتوں میں متعذّر۔ آفتاب میزان میں آیا اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا اور میں نے احرامِ بیت المعمور رام پور باندھا، انشاء اللہ العلی العظیم۔ (۱۸ جون ۱۸۶۵ء)

یہاں تک جو کچھ میرزا نے لکھا تھا، وہ معمولی بات تھی۔ نواب خلد آشیان نے انھیں دعوتِ قدومِ رام پور دی، انھوں نے مناسب الفاظ میں اس کا جواب دے دیا۔ اب بدقسمتی سے انھوں نے مصاحبت کرنا چاہی۔ وہ عادی تھے، نواب فردوس مکان کے کہ جو چاہا، انھیں لکھ دیا۔ اب وسادہ آرائے رام پور جو ہستی تھی، وہ کچھ اور مذاق کی تھی اور ان کی اسی معاملہ نافہمی نے انھیں آگے چل کے بہت حیران اور پریشان کیا۔ اس خط کے آخر میں میرزا نے بلا ضرورت نواب خلد آشیان کی خدمت میں ایک مشورہ پیش کر دیا۔ لکھتے ہیں[۲۱]:

پیر و مرشد! ازراہِ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خان ابنِ وزیر محمد خان رئیسِ ٹونک نے بعد مسند نشینی گورمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دیے۔ اور وہاں سے وہ ان کو عطا ہوئے۔ حضور کے اجدادِ امجاد نے سلاطین بابریہ کا خطاب نہ قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِ امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک" و "بہرام جنگ" جناب ملکۂ معظمہ سے بذریعۂ گورمنٹ اپنے واسطے لیں۔

۲۰۔ ایضاً، متن: ۳۸

۲۱۔ ایضاً

اگرچہ اس میں کوئی خاص قابلِ اعتراض بات نہیں تھی، لیکن یہ مشورہ "ایاز قدرِ خود بشناس" کے اصول کے خلاف بھی تھا۔ کچھ ہو، غالب کی حیثیت محض شاعر کی تھی۔ انھیں بغیر پوچھے صلاح ومشورہ دینے کی ضرورت نہیں تھی؛ پھر مشورہ بھی ایسا کہ اس میں ریاست کے عزّو وقار اور سیاستِ عالیہ کے مسائل مختلط ہو گئے تھے۔ بادشاہوں سے متعلق تو حکیم شیراز لکھ ہی گئے ہیں کہ "گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند۔" نواب خلد آشیان بھی بگڑ گئے اور اس کے جواب میں دو ٹوک عتاب نامہ صادر فرمایا:[۲۲]

استعمالِ الفاظِ خطاب دستورِ ایں ریاست نہ بودہ است۔

مرزا ایسے نادان تو تھے نہیں، فوراً سمجھ گئے کہ چوک ہو گئی اور نواب صاحب خفا ہو گئے ہیں۔ انھوں نے چاہا تھا، خیر خواہی اور اخلاص کا اظہار کرنا، اور یہاں الٹا عتاب نازل ہو گیا۔ قدرتاً وہ گھبرائے۔ شاید یہ اندیشہ بھی گذرا ہو کہ کہیں نواب صاحب غصے میں آ کے وظیفہ ہی نہ بند کریں۔ چنانچہ یہ فرمان موصول ہوتے ہی انھوں نے یہ منظوم معذرت نامہ تحریر کیا۔[۲۳]

ہزار و دو صد و ہشتاد و دو شمار کنید	بحسبِ ضابطہ از ہجرتِ رسول اللہ
چہار شنبۂ آخر بود، زماہِ صفر	کہ می در آورم، ایں قطعہ را بنظم نگاہ
سفیدۂ سحری کاغذ است و من راقم	سوادِ خط نمطِ ردے بدسگال سیاہ
ہمی نویسم و وقتِ نوشتنم باشد	دلے زبیم لبالب، چو لب زعذرِ گناہ
خدا کند، کہ مشرف شود، چو ایں قرطاس	بہ پیشِ مسندِ عالی، زبندۂ درگاہ
امیر کلب علی خاں بہادر، از رہِ لطف	بسوے غالبِ خونیں جگر، کنند نگاہ
کہ ایرِ فلک زدہ، گر عرض کرد مصلحتے	بزعمِ بندہ ز اخلاص بود، ورنہ گاہ
خلافِ طبعِ مبارک فتاد آں تحریر	بسے خطا رود، از بندگانِ دولت خواہ
تو بادشاہ و شہنشاہ، تاجدارِ فرنگ	خطاب می طلبد بادشاہ ز شاہنشاہ

چو راے من نہ پذیری، ز جرمِ من بگذر
بحقِ اشہدُ اَن لَا اِلٰہ، اِلّا اللہ

۲۲- ایضاً، حواشی: ۱۵۲

۲۳- سبد چین (مرتبہ مالک رام): ۳۸

اس قطعے میں میرزا نے جس طرح مذہبی جذبات سے کام لینے کی کوشش کی ہے، وہ خاص طور پر غور کے قابل ہے۔ بہرحال بظاہر نواب صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا اور غالباً انھوں نے میرزا کو معاف بھی کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات آسانی سے بھولنے والی نہیں تھی۔

میرزا کو اگست ۱۸۶۵ء کی معمولی تنخواہ موصول ہوئی ہے، تو ان ایام میں نواب خلد آشیان کی طبیعت قدرے کسل مند تھی۔ میرزا نے رسید کے خط میں[۲۴] بھی ایک فقرہ حسنِ طلب کا لکھا اور اس کے ساتھ ایک منظوم قطعہ بھی بھیجا۔ اس کے آخر میں یہ دو شعر تھے۔

جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے — بڑے عذاب سے کاٹے ہیں، پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات — خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس!

نواب صاحب نے صحت یاب ہو کر شکرانے کے طور پر بہت سا روپیہ بطورِ خیرات تقسیم کیا تھا۔ یہ خط ملنے پر انھوں نے میرزا کو بھی دو سو روپیہ کی رقم اسی تقریب سے بھیج دی اور لکھا کہ اس موقع پر جیسے اور "صاحبانِ مستحقین" کو اس سرکار سے عطیے بھیجے گئے ہیں، آپ کو بھی یہ رقم بھیجی جا رہی ہے۔[۲۵]

اس کے شکریے میں میرزا نے جو خط لکھا ہے، اس میں بعض کلمے بہت تملّق آمیز ہیں اور نواب خلد آشیاں کے مذاقِ طبع کے عین مطابق۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میرزا انھیں خاص طور پر خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پورا خط ملاحظہ ہو![۲۶]

حضرت ولیِ نعمت، آیۂ رحمت، سلامت

بعدِ تسلیم عرض یہ ہے۔ فقیرِ تکیہ دار، روزینہ خوار، غالبِ خاکسار، حیران ہے کہ شکر بجا لائے آپ کی عنایت کا، یا ذکر کرے آپ کی کرامت اور ولایت کا۔ آپ بے شبہ رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں؛ بتکلف برطرف، امیر المسلمین ہیں۔ یہ نہ فقط از روے ارادت ہے، بلکہ یہاں مشاہدۂ خرقِ عادت ہے۔ ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار (قرضخواہ مراد ہے) سرگرم تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپے کی ہنڈوی صراحیِ آبِ حیات

۲۴۔ مکاتیب غالب، متن: ۴۰۔۴۱ ۲۵۔ ایضاً، حواشی: ۱۵۳
۲۶۔ ایضاً، متن: ۴۴۔۴۵

ہو گئی۔ دامِ مرگ سے نجات ہو گئی۔

میرزا اسی دن صبح کے وقت نواب خلد آشیان کی مدح میں ایک قصیدہ، طرزِ خاص میں لکھ کے روانہ کر چکے تھے۔ اس میں حرفِ مطلب کو یوں زبانِ قلم سے ادا کیا ہے[۲۷]:

شد آں کہ بود کلامم طلسمِ گوہر بار — ہمارہ نہر ز آبِ گہر دراں جاری
چو حمزہ کش بعقابین درکشید فلک — بہ دامِ وام، نفس می کشم بدشواری
لقاست قرض و منم حمزہ و زبہرِ مَنَند — چہل خلیفہ تقاضائیانِ بازاری
چو ساحراں، ہمہ راشغلِ آتش افشانی — چو اژدہا، ہمہ راذوقِ آدم اوباری

. . . .

رموزِ حمزہ فروہل، ہمش نشیں غالب — چرامرا بسخنہاے ہرزہ آزاری
زتست رونقِ گیتی بہ دانش آرائی — زتست زینتِ معنی بہ نغز گفتاری
قصیدۂ تو، ولے، کاسۂ گدائی تست — ستوہ آمدہ باشی ز رنجِ ناداری
غمیں مباش کہ از گنج خانۂ نواب — خود آں قدر کہ بدل داشتی، بدست آری
بوقتِ گدیہ، گدارا دعاست دست آویز — برآر دست بدرگاہِ حضرتِ باری
چراغِ دودۂ سرورعلی محمد خان — گزیں ہمالِ تمرُّ درفنِ سپہ داری
زروے کلب علی خان ہمیشہ روشن باد! — چنانکہ تابشِ مہر از سپہر زنگاری

مندرجۂ صدر خط کے آخر میں اس قصیدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲۸]:

لطف یہ کہ آج بروزِ دوشنبہ ۲۱ اگست کو ۹ بجے اوّلِ روز ایک قصیدے کا لفافہ بھیجا گیا۔ اسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت (یعنی دو سو کی ہنڈوی کا پہنچنا) دیکھا گیا۔ قصیدے کے لفافے میں ایک عرضداشت ہے۔ اس سے قصیدے کی حقیقت اور خود اس نظم سے، طرزِ نگارش کی جدت ظاہر ہو جائے گی۔ حضرت کے انبساطِ خاطر کے واسطے یہ ایجاد ہے۔ مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خوشنودی مراد ہے۔ انجامِ قصیدہ میں جو قرض کے گلے پائے جائیں، اس مجموع میں سے "اہلِ بازار" مہاجن کیے جائیں۔ کوٹھی والے ساہوکار، چہل

۲۷۔ ایضاً: ۴۳-۴۴

۲۸۔ ایضاً، متن: ۴۵

خلیفہ گنے جائیں۔

دو چار دن بعد میرزا نے تقویتِ قلب کے لیے ایک معجونِ طلائی کا نسخہ، نواب صاحب مغفور کی خدمت میں بھیجا[۲۹] نواب صاحب نے ان دونوں خطوں اور قصیدے اور نسخے کا شکریہ ادا کیا اور ۲۱ اگست والے خط اور قصیدے کے حسنِ طلب کو نظر انداز کر دیا۔

نواب خلد آشیان نے اپنی مسند نشینی کا جشنِ جمشیدی دسمبر ۱۸۶۵ء کے پہلے ہفتے میں منایا تھا۔ اس موقع پر قدرتاً بہت شان و شوکت اور داد و دہش کا مظاہرہ ہوا تھا۔ خود نواب صاحب نے بہت کچھ خیرات کی تھی۔ اُن کی سواری پر سے روپوں کی بارش کی گئی تھی۔ میرزا کی تندرستی ان دنوں بہت سقیم تھی اور وہ اس سفر کی کھکھیڑ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ انھوں نے پچھلے تین چار برس پھوڑوں اور خون کے کھولاؤ کے سبب بہت تکلیف میں کاٹے تھے۔ اس کے باوجود وہ اس جشن میں شمولیت کے لیے رام پور گئے۔ بے شک، جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے، ان کا اصلی مقصد نواب فردوس مکان کی تعزیت اور نواب خلد آشیان کی تخت نشینی کے لیے تہنیت کا اظہار تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُن کے دل میں یہ بات ضرور تھی کہ ایسے مبارک اور اہم موقع پر جب تمام متوسّلینِ ریاست پر انعام و اکرام کی بارش ہوگی، یہ ناممکن ہے کہ انھیں فراموش کر دیا جائے۔ وہ نواب فردوس مکان کے زمانے سے دربارِ رام پور سے وابستہ تھے۔ اس لیے ضرور تھا کہ نواب کلب علی خان اپنے والدِ مرحوم کے استاد سے شایانِ شان سلوک کرتے۔ انھیں قرض خواہوں سے گلو خلاصی کرانے کے لیے جتنی رقم کی ضرورت تھی، وہ صرف رام پور سے مل سکتی تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر وہ ذاتی طور پر رام پور نہ گئے، تو آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل کے مصداق کہیں وہ بالکل نظر انداز نہ کر دیے جائیں۔ اسی لیے وہ صحت کی کمزوری اور خرابی کے باوجود "ذوقِ قدم بوس میں جوانانہ،" گئے تھے۔ وہاں سے انھوں نے جو خط مرزا تفتہ کو لکھا ہے[۳۰] اس سے ان کی توقعات بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

۲۹۔ ایضاً: ۴۵-۴۶

۳۰۔ خطوط غالب: ۹۸-۹۹

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب ازروے صورت، روحِ مجسم اور باعتبارِ اخلاق، آیتِ رحمت ہیں، خزانۂ فیض کے تحویل دار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اس کے پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلّے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا مطالبہ معاف کر دیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نول کشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا میں لیا، واسطے منشی صاحب کے، کچھ عطیہ بتقریبِ شادیِ صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ (۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء)

یہ خط بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ یہ ساری تفصیلات بے معنی نہیں۔ دراصل یہ ان کے تحت الشعور کی آواز ہے۔ گویا یہ وہ تفتہ کو نہیں لکھ رہے ہیں، بلکہ جو خیالات ان کے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں، انھیں کو بآوازِ بلند اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جو شخص اس قدر فیّاض اور جوّاد ہے، ممکن نہیں کہ وہ دس پندرہ ہزار میری جھولی میں بھی نہ ڈال دے۔ وہ حقیقت میں اپنے شکوک رفع کرنے کو یہ تمام عطیات گن رہے ہیں، جو دوسروں کو عطا ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ انھیں اپنی توقع میں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے تھے[۳۱]۔ نواب خلد آشیاں کی طرف سے انھیں ۳۰ اکتوبر کو ایک ہزار روپیہ عطا ہوا۔ تفتہ کے نام کا محولۂ فوق خط انھوں نے ۲۸ نومبر کو لکھا ہے۔ یعنی تخت نشینی کے جشن سے پہلے؛ یہ جشن یکم دسمبر سے ۵ دسمبر تک رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزار کو کافی یا آخری عطیہ نہیں سمجھتے تھے اور ابھی "وقتِ رخصت اپنی قسمت اور منعم کی ہمت" پر امید لگائے بیٹھے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا، کہ تقریبِ تخت نشینی کے سلسلے میں جو کچھ انھیں ملنا تھا، وہ مل چکا ہے اور اب اس "خزانۂ فیض" سے اور کوئی رقم ان کی "قسمت" میں نہیں لکھی ہے۔ وہ ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو واپسی کے لیے روانہ ہوئے، تو اس سے دو دن پہلے مزید دو سو روپے انھیں زادِ راہ کے لیے

۳۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ذکرِ غالب: ۱۲۴-۱۲۵

ملے۔ بے شک نواب خلد آشیاں نے "تعظیم، تواضع، اخلاق" کسی بات میں کمی نہیں کی تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! قرض خواہوں کا قرض اور خاندان کا روزمرّہ کا خرچ تو روپیہ چاہتا تھا، اور یہی انھیں مہیّا نہ ہوا۔ لے دے کے بارہ سو روپیہ۔ غرض وہ رام پور کے اس سفر کے بعد بھی ویسے ہی "پیر و ناتوان" رہے، جیسے اس سے پہلے تھے۔

میرزا کی فطرت اور طبیعت کا گہرا مطالعہ بہت دلچسپ چیز ہے۔ ان کی ساری زندگی ایک مسلسل کشمکش کی داستان ہے، لیکن اس کے باوجود وہ کبھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں ہوئے۔ انھیں جو تلخ تجربہ اس سفر میں ہوا تھا، وہ کافی سبق آموز اور آنکھیں کھول دینے والا تھا۔ لیکن دو مہینے بھی نہیں گذرتے کہ وہ ۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء کو "جشنِ حال کی نذر" کے طور پر ایک غزل نواب خلد آشیاں کی خدمت میں بھیجتے ہیں[۳۲] اس کے یہ شعر غور کے قابل ہیں:

شہ نشاں کلب علی خاں کہ توئی یوسفِ ثانی
نبود ثانی و ہمتاے تو در دھر، ہمانا

دانم، از حال و مآلم خبرے داشتہ باشی
سرنوشتِ ازلی گرچہ ندارد خطِ خوانا

دشمنم چرخ و تو بینی، دلسوزی بعتابش
بہ عدو صاعقہ ریزا، بہ محب فیض رسانا!

غالب! از غم چہ خروشی، بتو زیباست خموشی
باکریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا!

یہ اشعار کسی حاشیے کے محتاج نہیں۔ لیکن میرزا کو اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ "کریم ہمہ دان" ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میرزا اس پر بھی کوشش سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوئے۔ دو مہینے بعد ۹ جون ۱۸۶۶ء کو ایک خط لکھتے ہیں[۳۳]:

> بعدِ تسلیم معروض ہے۔ جب بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی، تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے:
>
> غالب! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
> وہ دن گئے کہ کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"
>
> اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت کے پسند آئے۔

۳۲۔ مکاتیب غالب، متن: ۵۱۔۵۲۔ نیز دیکھیے سبدِ چین: ۶۶

۳۳۔ مکاتیب غالب، متن: ۵۳

اس کے بعد پوری غزل نقل کی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس غزل کا ہر ایک شعر اس موقع پر عین چسپاں ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ تازہ فکر ہو، اور خاص نواب خلد آشیاں ہی کے لیے لکھی گئی ہو۔ دیکھیے کس طرح ہر ایک شعر میں نواب صاحب سے خطاب ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل!
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے، سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

اور آخر میں خاص اس موقع کے لیے ایک نیا قطعہ شامل کیا ہے:

در پر امیرِ کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسد!
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

نواب خلد آشیاں کا جواب ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں[۳۴]:

مفاوضۂ عدیم المعاوضہ مع غزل من تصانیف آپ کے وصول شادمانی کالایا....

سبحان اللہ! مضمون اور طرز ہر ایک شعرِ غزلِ مذکور کا نیا اور عدیم المثال ہے۔

یعنی اللہ اللہ خیر سلاّ۔

میرزا نے یہ غزل ۹ جون ۱۸۶۶ء کو بھیجی تھی۔ اسی دن شام کو انھیں مئی کے مہینے کی تنخواہ موصول ہوئی۔ اگلے دن اس کی رسید بھیجتے ہوئے پھر ارکرتے ہیں[۳۵]:

آج صبح دم، وقتِ تحریر اس عرضی کے، حضرت فردوس مکان کا دیوان پیشِ نظر تھا۔

۳۴۔ ایضاً، حواشی: ۱۶۲

۳۵۔ ایضاً، متن: ۵۳

اُس میں یہ شعر نظر پڑا۔ اس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر حضرت بھی حظ اٹھائینگے:

وہ جس طرح سے جسے چاہے، اُس طرح پالے
کسی کا کچھ نہیں پروردگار پر لینا

یقیناً نواب صاحب مغفور نے اس شعر کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ سے ضرور حظ اٹھایا ہوگا، لیکن میرزا کا یہ وار بھی خالی گیا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واضح ہوا ہوگا کہ

اوّل — میرزا کے جو بے تکلفانہ تعلقات نواب فردوس مکان کے ساتھ تھے، ان میں ان کے جانشین نواب خلد آشیان کے عہد میں بہت کمی آگئی تھی۔

دوم — اس زمانے میں میرزا بہت مالی مشکلوں میں مبتلا تھے اور انھوں نے متعدد موقعوں پر نواب خلد آشیان کی خدمت میں لکھا بھی، لیکن کسی وجہ سے نواب صاحب مغفور ان کی مدد کرنے سے قاصر رہے۔

۱۰ اگست ۱۸۶۶ء کو میرزا کو منشی رام پور کا خط ملا،[۳۶] جس میں انھوں نے لکھا کہ جولائی کی تنخواہ دو ایک دن میں روانہ ہونے والی ہے۔ اس پر میرزا بہت گھبرائے کہ اگر ۱۰ تاریخ کو روانگی کا وعدہ ہو رہا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ واقع میں تنخواہ کہیں بیس تاریخ کو موصول ہوگی۔ اس پر انھوں نے بہت گھبراہٹ کا خط جناب نواب صاحب کی خدمت میں لکھا:[۳۷]

> یارب! ۱۰ کو وعدہ، ۱۳-۱۴ کو چلیگی؛ بیسویں تک مجھے پہنچیگی، اور میرا یہ حال کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گذرتی ہے۔ چار ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔

افسوس کہ نواب صاحب نے اس صریح درخواست پر بھی اغماض سے کام لیا۔ اس کے

۳۶- ایضاً : ۵۵

۳۷- ایضاً

تھوڑے دن بعد نواب مرزا خاں داغ دلّی آئے، تو میرزا اپنا دکھڑا ان کے سامنے روئے کہ کسی طرح نواب صاحب کے کانوں تک ان کا احوال پہنچا دیں اور مدد کی درخواست کریں، تاکہ قرض سے نجات ملے۔ جب اس پر بھی کچھ نہ ہوا، تو انھوں نے پھر لکھا:[۳۸]

افسوس، کہ برخوردار نواب مرزا خان نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا! حضور ملک و مال جس کو، جس قدر چاہیں، عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرضِ باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔ (۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء)

معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نواب صاحب نے دو قسطوں میں " ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کے درمیان " ساڑھے چار سو کی امداد، قرض کی ادائی کے لیے دی تھی؛[۳۹] لیکن یہ درخواست کہ " آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے "، پھر بھی منظور نہیں ہوئی۔

اسی زمانے میں ایک اور افسوسناک حادثہ پیش آیا، جس نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ لکھ چکا ہوں کہ نواب خلد آشیان کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ وہ فارسی کے منتہی تھے، اور یہ زبان انھوں نے خلیفہ غیاث الدین (مولف غیاث اللغات) سے حاصل کی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے صاحبزادے شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی سے علمِ منطق و فلسفہ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اردو میں امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ فارسی کلام، مرزا محمد تقی خان سپہر (مولف ناسخ التواریخ) کو دکھایا تھا۔ نواب فردوس مکان کی وفات کے بعد وہ میرزا کے شاگرد تو ہو نہیں سکتے تھے، کیونکہ پہلے سے امیر مینائی سے مشورہ تھا، لیکن اگست ۱۸۶۶ء میں، انھوں نے ایک فارسی نثر ان کی خدمت میں بغرضِ اصلاح روانہ کی۔

ہوا یہ کہ نواب صاحب کے دیرینہ مصاحب، مولوی محمد عثمان خان بہادر مدارالمہام ریاست نے

۳۸۔ ایضاً، متن: ۶۰

۳۹۔ ایضاً، دیباچہ: ۱۳۷ (اندراج نمبر ۱۶)

قصائدِ بدر چاچ کی شرح لکھی اور نواب خلد آشیان کو اس کی تقریظ لکھنے پر آمادہ کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے فارسی میں تقریظ لکھی اور اسے میرزا کے پاس اصلاح کے لیے بھیج دیا۔ اگر یہ مرحلہ حسن و خوبی طے ہو جاتا، تو گمان، بلکہ یقین ہے کہ تعلقات خوشگوار ہو جاتے اور غالباً میرزا کو بقیہ عمر کے لیے مالی پریشانیوں سے بھی نجات مل جاتی، لیکن "تہی دستانِ قسمت" کو "رہبرِ کامل" سے کیا فائدہ! بدقسمتی سے نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔

جب یہ نثر، میرزا نے دیکھ کر واپس بھیجی تو نواب صاحب کو بعض اصلاحوں سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ مثلاً نواب صاحب نے اپنی تحریر میں لکھا تھا "..... رشکِ ارژنگ مانی ساخت"، میرزا نے یہاں قلم زد کر کے اس کی جگہ ارژنگ بنا دیا۔ ایک جگہ نواب صاحب نے "آشیاں چیدن" محاورہ لکھا تھا۔ میرزا نے اس کی جگہ "آشیاں بستن" یا "آشیاں ساختن" کر دیا۔ اسی طرح غالباً میرزا نے لفظ "عذرا" پر بھی کچھ ایراد کیا تھا۔ نواب صاحب نے اس پر لکھا کہ آپ نے تقریظ غالباً جلدی میں دیکھی ہے۔ اگر ان الفاظ کی صحت میں کلام ہے، تو مطلع کیا جاؤں اور ساتھ ہی کتبِ لغات اور عرفی وغیرہ کے کلام سے اپنے مستعملہ الفاظ کی صحت پر استناد کیا۔

> معہذا، اگر طبعِ آں استادِ زماں، بہ ترقیمِ الفاظِ بالا، فی الجملہ نفورے داشتہ، ہم چناں حوالۂ قلم نمایند کہ بحوث عنہ را، از تقریظِ اصلاح شدہ، چو نفسانیتِ خود، محو سازم زیرا کہ مرا از اں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است، نہ از عرفی و دیگراں [۴۰]

نواب صاحب نے یہ خط بہت تحمل اور احتیاط سے لکھا ہے، لیکن ماننا پڑیگا کہ چونکہ انھیں غالب سے تلمذ کا تعلق نہیں تھا، اس لیے یہ بات انھیں لکھنا نہیں چاہیے تھی؛ اور دراصل میرزا اسی سے دھوکا کھا گئے۔ ان کی جو شامت آئی، انھوں نے اس خط کے جواب میں ڈون کی لی اور بے ضرورت اپنی فارسی دانی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ لکھتے ہیں[۴۱]:

> اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا، "مرا از اں مشفق

۴۰۔ مکاتیب غالب، حواشی: ۱۷۴

۴۱۔ ایضاً، متن: ۶۰-۶۱

واسطۂ تلمذ بودہ است" یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔
بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے، مراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ دعویِ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریق یاد نہیں۔
میاں انجو، جامعِ فرہنگِ جہانگیری، شیخ رشید، راقمِ فرہنگِ رشیدی، علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد۔ ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی۔ نورٌ علیٰ نور!
فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں، ان کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں کیونکر ان کے قیاس پر تکیہ کروں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ و ارژنگ" متحد المعنی اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا، لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بموجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق۔ (۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء)

یہ خط بڑی بے احتیاطی سے لکھا گیا ہے۔ میرزا نے خیال کیا ہوگا کہ جیسے میں اور ہندی فارسی دانوں کو ڈانٹ بتا دیا کرتا ہوں، ویسے ہی اب بھی مخاطب کو خاموش کر لونگا۔ یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ یہاں ان کا سابقہ ایک ایسے شخص سے تھا، جو فارسی دانی کے ادعا کے ساتھ میرزا کا محسن اور سرپرست اور ایک ریاست کی حکمرانی پر متمکن تھا۔ نواب صاحب نے میرزا کے اس خط کے جو معنی لیے، وہ یقیناً میرزا کا مقصود نہیں تھا مثلاً اس فقرے "میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں"، کو نواب صاحب نے تعریض پر محمول کیا۔ اس کنایے کا برا مانا۔ اسی طرح میرزا کا یہ فقرہ "بحث کا طریق یاد نہیں" اس سے نواب صاحب نے

خیال کیا کہ میرزا کا مدّعا یہ ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچّے ہیں، تو ہوتے رہیں، میں آپ کو کیا سمجھاؤں اور آپ سے کیا بحث کروں!

نواب صاحب بھی دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کی طرح اپنے پیش روؤں کے مقلّد تھے، بلکہ انھوں نے فارسی مؤلفِ غیاث اللغات، مولوی غیاث الدین عزّت رام پوری سے پڑھی تھی؛ اور مولوی صاحب موصوف اور ان کے لغات سے متعلق میرزا کی جو رائے تھی، وہ ہم جانتے ہی ہیں۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا بیکار تھا کہ نواب صاحب، غالب کے ہم نوا ہو کر تمام ہندستانی لغت نویسوں کو غیر مستند قرار دے دینگے۔

غرض کہ نواب صاحب اس خط پر بہت خفا ہوئے۔ اور انھوں نے اِس کا جو جواب دیا ہے، اُس سے واضح طور پر عیاں ہے کہ اُن کے دل میں کس قدر غم و غصہ ہے۔ لیکن آدمی تھے بہت متحمل مزاج اور سیاست دان، اس لیے انھوں نے اپنا مدّعا ہاتھ کو بہت روک کر لکھا۔ ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجیے[۴۲]:

مکتوبِ حیرت اسلوب، مشعرِ اختراعِ معنیِ غلط نسبتِ ہندی نژادانِ پیشین و دیگر اعتراض ہا، و ایں کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصولِ مطالعہ گشتہ، باعث استعجابِ عظیم گردید۔ از آنجا کہ تا حال ورائے تحقیق و تنقیحِ امورِ علمیہ کہ معاذ اللہ! از مناظرہ و مناقشۂ بحثیم حق بیں بسا بعیدی نماید، امرے دیگر بظہور نیامدہ، و آنچہ حالیِ خاطرم بودے، بے ریب و رنج، حوالۂ قلمِ دقائق سنج گردیدہ۔ ولیکن می نازم، بر ذہنِ موشگافِ آں فریدِ زماں کہ نوشتہ ام را بحث و اجتہاد محمول نمودہ، امثالِ ایں کنایہ ہائے نو مثلِ نسبتِ استادی بجانبِ راقم، و لفظِ بحث کہ ہر دو خلافِ واقع و مورثِ رنج و عنا است، نگاشتند۔ پس اگر آں مشفق را ہمچنیں منظور باشد، اشارتے سازند کہ واسطۂ رسل و رسائل از فیما بین برداشتہ شود۔ ورنہ بنانِ خامہ را بامورِ خارج البحث تکلیف نداده باشند کہ نتیجہ اش سوائے صداع از اِیں امرے بخیال نمی رسد۔ و راقم پایۂ اعتبارِ محققاں کہ صاحبِ تصانیفِ مقبولۂ انام بودہ اند، از خود زیادہ دانستہ۔ بحوالۂ کلامِ شاں پرداختہ۔ اگر نزدِ آں صمیم [؟]، جاوید۔ آنہا قابلِ قبول نبود۔ بایستے کہ ہم برآں نمط تحریرے ساختند۔ مصلحتِ ایں قدر اطنابِ سخن از فہم بیرون۔

۴۲۔ ایضاً، حواشی: ۱۷۵

زیادہ ازیں نوشتن حکمت بلقمان آموختن است۔

جب میرزا کو یہ خط ملا، تو انھوں نے فوراً لکھا[۴۳] کہ بحث سے ہرگز یہ مدعا نہیں تھا کہ میں حضور کی تحریر کو بحث یا مناقشے پر محمول کرتا ہوں اور آپ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اگرچہ ان کا یہ عذر مبنی بر حقیقت تھا، لیکن کیا کیجیے کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نواب صاحب نے لکھا[۴۴] کہ چوں کہ آپ نے اب اپنے لکھے کی تاویل کی ہے۔ اس لیے ہم چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کے بعد انھوں نے کوئی نظم و نثر مشورہ کی غرض سے میرزا کے پاس نہیں بھیجی، جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ انھوں نے بات کو طول دینا بیکار خیال کیا، لیکن دراصل ان کے دل میں جو گرہ بیٹھ گئی تھی، وہ نہیں کھلی۔

انصاف بالائے طاعت است، واقع یہ ہے کہ شروع میں نواب صاحب نے بہت بردباری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا اور انھوں نے جو کچھ غالب کی اصلاحوں سے متعلق لکھا تھا، اس پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ "بحث کا طریق یاد نہیں" (اور یہی فقرہ سارے فساد کی جڑ بن گیا) میں میرزا کا اشارہ قطعاً نواب خلد آشیان کی طرف نہیں تھا۔ غالب صرف اتنا کہنا چاہتے تھے کہ میں اپنی تحقیق پر مطمئن ہوں۔ دوسرے ہندستانی فارسی دانوں اور لغت نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے، مجھے اس سے سروکار نہیں۔ یہی انھوں نے نواب صاحب کے اس عتاب نامے کے جواب میں لکھ بھیجا۔ لکھتے ہیں[۴۵]:

> انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرائے ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں۔ یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو ان کی عقول میں اختلاف ہیں، ان میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں۔ اور دل سے مجھے حجت نہیں۔ باہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہو سکتا اگر اس کو

۴۳۔ ایضاً، متن: ۶۱

۴۴۔ ایضاً، حواشی: ۱۰۶

۴۵۔ ایضاً، متن: ۶۱۔۶۲

گناہ سمجھا جائے۔ ع : آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں۔ گناہ معاف کیجیے اور نوید عفو سے مجھ کو تقویت دیجیے۔ (۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء)

لیکن جیسا کہ بیان ہوا، اگرچہ نواب صاحب نے انھیں معاف کر دیا اور یہ قضیۂ نامرضیہ ختم ہو گیا، لیکن اس کے بعد انھوں نے کوئی اور چیز اصلاح یا مشورے کی غرض سے ان کے پاس نہیں بھیجی۔ اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی ناراضی پورے طور پر دور نہیں ہوئی تھی۔
اس کے بعد میرزا ڈھائی برس اور جیے، اور یہ تمام زمانہ ان کا بہت عسرت میں گذرا۔ انھوں نے متعدد رقعوں پر نواب خلد آشیان سے مدد کی درخواست کی۔ طرح طرح سے ان کے سمع مبارک تک اپنی مشکلات کا حال پہنچایا، لیکن ان کا دل نہ پسیجا۔ دیکھیے کیسے کیسے خط لکھے ہیں:[۴۶]

کہ نہیں سکتا اور بن کہے بنتی نہیں۔ اگر دونوں لڑکوں کا پچاس روپیہ مہینا، جنوری ۱۸۶۷ء یعنی ماہِ حال و سالِ حال سے جاری ہو جائے گا اور ماہ بماہ فقیر کے روز ینے کے ساتھ پہنچا کریگا، تو آپ کا نمک خوار پھر کبھی قرضدار نہیں ہو گا۔
(۸ جنوری ۱۸۶۷ء)

اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے۔ دورانِ سر اور رعشہ، اور ضعفِ بصر: تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی، ہفتوں یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے۔ (۱۲ مارچ ۱۸۶۷ء)[۴۷]

ان دونوں درخواستوں کا کوئی جواب عطا نہیں ہوا۔

بعدِ تسلیم معروض ہے: آپ کے غلامِ زر خرید یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی اور اور اپنے کنبے میں ہوئی۔ یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے کی شرم آپ کے ہاتھ

۴۶۔ ایضاً ۶۶
۴۷۔ ایضاً ۶۸

ہے۔ (۱۹ اگست ۱۸۶۷ء)[۴۸]

اس پر نواب صاحب نے دریافت فرمایا[۴۹] کہ آپ صراحت سے لکھیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔
غالب نے جواب میں دو باتیں لکھیں[۵۰] پہلی یہ کہ :۔

میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ وسیمینہ کا نام ونشان نہیں۔ ہنت ادھار کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں تا یہ کام سرانجام پائے، اور بوڑھے فقیر کی، برادری میں، شرم رہ جائے۔
دوسری بات یہ کہ سو روپے آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور ساڑھے باسٹھ مہینا انگریزی سرکار سے بعوضِ جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤنگا؟ حسین علی خان کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے لیکن توقیعِ تنخواہ اس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اس کی زوجہ حسن جہان بیگم بنت اکبر علی خان کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو اور اس کی مُہری رسید سے ملا کرے۔
زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔ (۵ ستمبر ۱۸۶۷ء)

نواب صاحب نے پھر پوچھا[۵۱] کہ پہلے مصارفِ شادی کی مقدار سے مطلع کریں، اس کے بعد مناسب کارروائی کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں میرزا نے لکھا[۵۲] کہ بڑے لڑکے باقر علی خان کی شادی نواب ضیاالدین احمد خان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ نواب ضیاالدین خان نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپے دیے تھے، اور میری بیوی نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو صرف کیے تھے۔

اب یہ میں کیوں کر عرض کروں کہ مجھے کیا دو، سائل ہوں۔ یہ رسم نہیں کہ سائل

۴۸۔ ایضاً : ۷۲
۴۹۔ ایضاً، حواشی : ۱۸۴
۵۰۔ ایضاً، متن : ۷۳
۵۱۔ ایضاً، حواشی : ۱۸۵
۵۲۔ ایضاً، متن : ۷۴

مقدارِ سوال عرض کرے۔ حالِ مصارفِ شادیِ خاندان لکھ دیا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائیگی، لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے، اس میں شادی کر دونگا۔ (۲۳ ستمبر ۱۸۶۷ء)

اس پر خموشی اختیار کر لی گئی۔ نومبر کے آغاز میں میرزا نے پندرہ شعر کا ایک قطعہ خدمت میں ارسال کیا "مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا"۔ اس میں خاص طور پر نواب خلد آشیاں کے "دستِ کرم" کی "دعلہ فشانی" کا ذکر کیا ہے[۵۳] نواب صاحب نے قطعے کی وصولی کی اطلاع دی[۵۴]:

مفاوضۂ عدیم المعاوضہ مع یک قطعہ بمضامینِ نو وطرز نادر رنگ افروزِ چہرۂ وصول گردید واز ملاحظۂ مضامین نوش، انشراحِ دل بحصول انجامید۔

۱۵ نومبر ۱۸۶۷ء کو حسین علی خان کی شادی سے متعلق یاددہانی کراتے ہیں[۵۵]:

پیر و مرشد، رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خان کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے بجز سکوت جواب نہیں۔

نواب صاحب کی طرف سے بھی بجز سکوت جواب نہیں ملا۔ ۲۹ دسمبر کو پھر لکھتے ہیں[۵۶]:

چوں کہ دھوپ تو نظر ہی نہیں آتی، ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں اور ہر وقت کانپتا ہوں۔

ماہِ صیام میں سلاطین و امراء خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خان یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آ جائے۔

جب اس خط کا بھی حسبِ سابق کوئی جواب نہ ملا، تو انھوں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔

۵۳۔ ایضاً: ۷۵

۵۴۔ ایضاً، حواشی: ۱۸۶

۵۵۔ ایضاً، متن: ۷۷

۵۶ ایضاً: ۷۸

تملق اور چاپلوسی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کو خوش کرنا یا اس سے کوئی رعایت حاصل کرنا منظور ہو، آپ اس سے براہِ راست مخاطب نہ ہوں، بلکہ اس کے کسی دوست یا قریبی ملنے والے سے اس کے بارے میں تعریفی اور مدحیہ باتیں کہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ باتیں شخصِ مذکور تک ضرور پہنچ جائینگی اور اس طرح آپ کی ساکھ اس کی نظر میں بڑھیگی۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ بسا اوقات انسان کسی شخص کے سامنے اس کی غیر معمولی مدح وثنا کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے، لیکن کسی غیر سے اس کے بارے میں مبالغہ کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا بلکہ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے، گویا اس میں خلوص اور صداقت ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کا یہ خط ملاحظہ کیجیے، جو انھوں نے مولوی محمد حسین خان رامپوری کے نام لکھا۔ مولوی صاحب موصوف مطبع حسنی، رام پور کے مہتمم اور اخبار "دبدبۂ سکندری" کے مدیر تھے۔ یہ اخبار نواب کلب علی خان والیِ رام پور کے حسبِ ایما اکتوبر ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا، اور اس کی حیثیت سرکاری جریدے کی تھی۔ لکھتے ہیں:[۵۷]

مشفقی اور مکرمی محمد حسین خان صاحب کو غالبِ آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے، کئی خط آپ کے پھیرے، اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا، یا کوئی جھوٹ کی پڑ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ، جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ۔ یہ غلط محض ہے کہ مطبع حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف سے۔ اللہ، اللہ دگبجے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ، کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو، اور اپنے والیِ ملک اور اپنے پادشاہ یعنی، امیر المسلمین نواب کلب علی خان بہادر کے نام کے آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو بس۔ اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے، تو گویا دگبجے سنگھ کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہو گی۔ ہندستانی عملداری میں وہ ایک زمیندار اور مالگزار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خان، رئیسِ ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ

۵۷۔ ایضاً: ۱۱۸

تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی، یک در گیر و محکم گیر۔ اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا کہ اپنے بادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو، کبھی صفحے پر، کبھی حاشیے پر! ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے۔ اور اب پھر تمھیں لکھتے ہیں کہ دوہائی خدا کی، میں یکم جنوری ۱۸۶۸ء سے 'دبدبۂ سکندری' کا خریدار نہیں ہوں۔ (۲۵ فروری ۱۸۶۸ء)

اس خط کے پیچھے جو نفسیات کام کر رہی ہے اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ خبر نواب کلب علی خان تک ضرور پہنچ جائیگی کیونکہ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، اس اخبار کی حیثیت ہی سرکاری جریدے کی تھی۔ جب انھیں معلوم ہوگا کہ غالب نے محض اس لیے اخبار کی خریداری منقطع کر دی ہے کہ اس کا مدیر نواب صاحب موصوف کے لیے مناسب تعریفی اور توصیفی کلمات نہیں لکھتا، یا ان کے حالات اتنے نمایاں مقامات پر نہیں چھاپتا، جتنا اسے کرنا چاہیے، تو موصوف کو غالب کی وفاداری اور ان سے تعلقِ خاطر کا یقین ہو جائیگا؛ اور وہ اس پر اور مہربان ہو جائینگے اور اس کی قدردانی فرمائینگے۔

لیکن ازلی بدنصیبی کا کیا علاج! یہ چال بھی ناکام رہی اور ان کی کوئی امید بر نہ آئی۔ لیکن ان کا ہاتھ پتھر تلے دبا تھا: وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب ایک قیامت کا خط ملاحظہ ہو:[۵۸]

عرض مدارجِ عجز و نیاز کے بعد نوازش نامے کے پہنچنے کا اور تنخواہِ فروری ۱۸۶۸ء کے پانے کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ! کیا برکت ہے، اس سو روپے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں، اور اس فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں۔

میرزا حسین علی خان کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذی قعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائینگے۔ تو آخر ذی الحجہ تک نکاح ہو جائیگا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہی گذرے

۵۸۔ ایضاً: ۷۹

کہ غالب جب بہو بیاہ لائیگا تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائیگا ! غرض
اس سے یہ کہ حسین علی خان کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت ! کوئی ایسا
نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے
شرم آتی ہے۔ (۹ مارچ ۱۸۶۸ء)

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور انھیں اس مطلبِ خاص سے متعلق کوئی جواب نہ ملا۔ پھر لکھتے ہیں[۵۹]:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعاے ضروری الاظہار
پیرومرشد، حسین علی خان کی سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی شکل ہوگئی
ہے۔ بطریقِ شیئاً للہ سوالِ مختصر یہ کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا
کیجے اور حسین علی خان کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجے، لیکن یہ دونوں امر
جلد صورت پکڑ جائیں۔ (۷ ستمبر ۱۸۶۸ء)

اس دردناک خط کا بھی نواب صاحب موصوف کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب "خانۂ انوری" پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ میرزا سال بھر سے حسین علی خان کی شادی کے لیے امداد طلب کر رہے تھے۔ یہ معاملہ ابھی طے نہیں ہو پایا تھا کہ ان کے قرض خواہوں نے انھیں تنگ کرنا شروع کیا۔ اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تندرستی بہت خراب ہو رہی تھی، اور حالت واقعی مخدوش تھی بھی۔ اس لیے قدرتاً ان قرض خواہوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ بڈھا اب چند دن کا مہمان ہے۔ خدا معلوم، کب آنکھیں بند کر لے۔ اس کے بعد ہماری رقم ڈوب جائیگی۔ اس لیے جو کچھ لینا ہے، اب لے لو۔ نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں[۶۰]:

آج ناچار از روے اضطرار و افتقار پھر یہ عرضی لکھتا ہوں۔ حال میرا تباہ
ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ سے چون روپے بچے۔ ترسیٹھ
روپے کا چٹھا ماہوار کا، سود سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپے ہوں، تو میری آبرو
بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خان کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔

۵۹- ایضاً: ۸۲
۶۰- ایضاً، ۸۳

اب اس باب میں عرض کروں، کیا مجال، کبھی نہ کہونگا - آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی، میری آبرو بچ جائے، تو غنیمت ہے - برخوردار نواب مرزا خان (داغ) کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے، وہ عرض کریگا - مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے بگر حضور، جو عطا فرمانا ہو، جلد ارشاد ہو۔ (۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء)

مگر اس الحاح پر بھی صدائے برنخاست - ایک مہینے کے انتظار کے بعد انھوں نے پھر لکھا:[61]

بعد تسلیم معروض ہے، بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خان نے مجھ کو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے ان کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائیگا۔ اس تحریر سے یاددہی منظور ہے (۱۰ دسمبر ۱۸۶۸ء)

جب دسمبر بھی گذر گیا اور کوئی حکم صادر نہ ہوا، تو جنوری میں دسمبر کی تنخواہِ معمولی کی رسید لکھتے ہوئے پھر عرض کی:[62]

حضور قرض خواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں - آگے حضرت مالک ہیں - (۸ جنوری ۱۸۶۹ء)

اس درخواست پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ اگلے مہینے ۱۵ فروری کو خود میرزا وہاں پہنچ گئے، جہاں نہ قرض خواہ انھیں عاجز کر سکتے تھے، نہ حسین علی خان کی سسرال والوں کے تقاضے کا ڈر تھا - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ -

تیرے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

میرزا کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی تھی - جنوری کا وظیفہ، ان کی موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا۔[63] ان کی وفات کی اطلاع میرزا حسین علی خان نے نواب خلد آشیان کی خدمت میں لکھ بھیجی، تو حکم ہوا کہ میرزا کی چودہ دن کی تنخواہ باخذِ رسید بھیج دی جائے، تاکہ یہ حساب بھی بیباق ہو جائے - چنانچہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرزا حسین علی خان کو لکھا گیا تھا کہ چودہ دن کی تنخواہ کی رسید لکھ کے بھیج دو - اس پر انھوں نے ۱۱ مئی کو اپنی مہر لگا کر رسید روانہ کر دی، اور چودہ دن کے پچاس روپے انھیں مل گئے -

---

۶۱- ایضاً : ۸۴ ۶۲- ایضاً

۶۳- ایضاً، حواشی : ۱۸۹

لیکن اصلی مصیبت تو وہ قرض تھا، جو میرزا چھوڑ مرے تھے اور جس کے ادا کرنے کے لیے وہ آخری ایام میں نواب صاحب مغفور سے امداد طلب کر رہے تھے۔ جب جولائی تک رام پور سے کوئی رقم نہ پہنچی، تو میرزا کی بیوہ امراؤ بیگم نے ۲ اگست کو ایک طویل عرضی، نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی، جس میں اپنا حالِ زار تفصیل سے لکھ کے امداد کی درخواست کی۔ اس میں قرض سے متعلق یہ لکھا تھا[۶۴]:

> دعاگو کی یہ تمنا ہے کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے کہ میرزا مرحوم حقِ عباد سے بری ہو جائیں کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورتِ ادائے قرض فرما دیں۔ تو کمالِ ثوابِ عظیم ہو گا۔ اور اگر دفعتہً صورتِ ادائے قرض مناسب رائے بیضا ضیائے نہ ہو، تو یہ تنخواہ ششش ماہ کی بحساب فی ماہ صدروپیہ بالفعل مجھ بیوہ کو عنایت ہو جائے۔ باقی چھ ماہ اور بحسابِ مذکورہ بالا مرحمت ہو جائیں، تاکہ میں بیوہ قرض میرزا صاحب کا ادا کر دوں۔ اور ظاہر الیقین ہے کہ زندگی میری بھی اسی میعاد میں پوری ہو جائیگی اور یہ احسان کرنا مجھ پر فی سبیل اللہ ہے کیونکہ میں ضعیفہ اور بیکس ہوں۔ اتنی عنایت سے آپ کی زندگی میری بسر ہو جائیگی۔" (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء)

اس درخواست سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم اس غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ میرزا کے بعد، ان کی تنخواہ سو روپے مہینا، ان کے نام منتقل ہو جائیگی۔ کیونکہ وہ لکھتی ہیں کہ "یہ تنخواہ ششش ماہ کی (یعنی فروری سے لے کر جولائی تک) بحسابِ فی ماہ صدروپیہ" مجھے عنایت ہو جائے؛ اور مزید یہ کہ "چھ ماہ اور" پیشگی عطا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں سال بھر کے بارہ سو (چھ ماہ بقایا اور چھ ماہ پیشگی) مرحمت ہوں، تاکہ آٹھ سو کا قرض ادا ہو جائے اور مجھے جینا آسان ہو۔ "اور ظاہر الیقین ہے کہ زندگی میری بھی اسی میعاد میں پوری ہو جائیگی" یعنی چھ ماہ پیشگی جو مرحمت ہونگے، اس میعاد میں۔

نواب صاحب موصوف نے اس درخواست پر بھی کوئی توجہ نہ کی، تو چار ماہ تک انتظار کر کے امراؤ بیگم نے دوبارہ درخواست پیش کی۔ اس پر نواب صاحب نے نواب مرزا خان داغ کو "مزید تحقیق و تصدیق" کے لیے حکم صادر فرمایا[۶۵]۔

۶۴۔ ایضاً، دیباچہ: ۶ ۶۵۔ ایضاً

غرض اس دوسری درخواست کے بھی پونے دو مہینے بعد ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو سرکار نے آخری فیصلہ فرمایا[۶۶] کہ چھ سو روپیہ، امراؤ بیگم کو بھیج دیا جائے۔
میرزا صاحب نے اپنی زندگی میں لکھا تھا کہ قرض کی رقم آٹھ سو روپیہ ہے۔ امراؤ بیگم نے بھی، اپنی درخواست میں اسی رقم کا اعادہ کیا ہے۔ چونکہ صرف چھ سو روپے بھیجے گئے تھے، اس لیے قیاس میں یہی آتا ہے کہ تحقیق سے یہی ثابت ہوا ہوگا کہ قرض صرف چھ سو ہے اور یہ لوگ زیادہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ اصل قرض تو چھ ہی سو ہو، اور بقیہ دو سو سود کے ہوں۔ ظاہر ہے کہ سود کی "غیر شرعی" رقم کی ادائی کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔
مقطع طالب آملی کی زبان سے سنیے:

حرفے بلب از جودِ تو آرم و از رشک
خوں در جگرِ حاتمِ طے می کنم امشب

۶۶- ایضاً۔ دیباچہ: ۷

غالب سوسائٹی

۱

غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو رحلت کی اور بستی نظام الدین میں چونسٹھ کھمبا کے متصل اپنی سسرالی بڑواڑ میں سپردِ خاک ہوئے۔ دلی کے اور باہر کے اخباروں اور رسالوں میں ان کی وفات کی خبر شائع ہونا ہی چاہیے تھی۔ اودھ اخبار، لکھنؤ اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ منشی نول کشور مرحوم اس کے مالک تھے۔ نول کشور کے غالب سے ذاتی تعلقات تھے اور انھوں نے غالب کی بعض کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ غالب کی وفات پر غالباً سب سے طویل مضمون اودھ اخبار کی اشاعت ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء میں چھپا۔ اس میں میرزا کی زندگی کے حالات خاصے تفصیلی ہیں؛ اور ان کی تصنیفات کا بھی بیان ہے۔

اسی پرچے میں وفات کی متعدد تاریخیں، اردو اور فارسی، بھی شائع ہوئی ہیں۔ قربان علی بیگ سالک[۱] کا مرثیہ (۱۹ شعر) بھی شاملِ اشاعت ہے۔

لیکن یہ تو معمولی بات ہے۔ مرثیے اور قطعاتِ تاریخ کس مشہور شاعر اور ادیب (یا امیر) کے لیے نہیں کہے گئے۔ غالب کے ایک شاگرد کو یہ خیال آیا کہ استاد کی یادگار میں کوئی ایسا مستقل کام کیا جائے، جس سے ان کا نام رہتی دنیا تک زندہ اور روشن رہ سکے۔ ایک ہفتہ بعد اودھ اخبار کی ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں محمد مردان علی خان رعنا[۲] (نظام) کا ایک طویل مراسلہ چھپا ہے، جس میں انھوں نے استاد کی یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

۱۔ حالات کے لیے دیکھیے، تلامذۂ غالب: ۱۴۰۔ ۱۴۳

۲۔ ایضاً: ۲۸۱۔ ۲۸۴

لکھتے ہیں[۳] :

اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب مرحوم کا ہندستان کے شاعروں میں بہت بلند مقام تھا۔ اور اسی لیے حالات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ حقیقی شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسے استاد کے لیے جنھوں نے اپنی صلاحیتوں سے ہندستان بھر کو مسحور کر رکھا تھا، ہمارا فرض ہے کہ ان کے نامِ نامی کے دوام کے لیے ایک یادگار قائم کی جائے۔ اور اس کام میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ حصہ لینا چاہیے، وہ ان کے شاگرد ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں ان کے عقیدتمندوں کے سامنے یہ تجویز رکھنا چاہتا ہوں کہ وہ بلا تاخیر پورے خلوصِ دل سے اس کام کا بیڑا اٹھائیں۔

پس میری حقیر رائے میں لازم ہے کہ دلّی کے اصحاب کی ایک خاص کمیٹی بلائی جائے اور وہ کسی تجویز کے بارے میں حتمی فیصلہ کرے۔ پھر جب معلوم ہو جائے کہ اس یادگار کے لیے کتنی رقم درکار ہوگی، تو ان اخراجات کے جمع کرنے کے لیے عطیات کی فہرست کھولی جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ایک خالص ادبی یادگار قائم کرنے کے حق میں ہوں، یعنی ایک مجلّد تیار ہو، جس میں اولاً، اردو اور فارسی میں، غالب کی زندگی کے مفصّل حالات، جن میں عوام کو کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے، ٹھیک ٹھیک قلمبند کیے جائیں؛ پھر وہ تمام نظم و نثر جمع کی جائے، جو ان کے تلامذہ ان کی یاد میں لکھیں؛ تاریخیں اور مرثیے جو ان کے شاگرد اُن کی وفات پر کہیں؛ ان تحریروں کے ساتھ ہر ایک شاگرد کا مختصر تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں مرتب ہو۔ ایک اردو میں، دوسرا فارسی میں۔ لیکن یہ تمام تحریریں، نظم ہو یا نثر، جو ان میں

۳۔ اودھ اخبار، ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء بحوالہ گارساں دتاسی: تاریخِ ادبِ ہندوی و ہندوستانی ۱: ۴۸۱ - ۴۸۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون: "غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز" (ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ [illegible] ۱۹۶۸ء) میں اس فرانسیسی تحریر کا ترجمہ پیش کیا ہے، لیکن یہ کہیں کہیں اصل عبارت سے ہٹ گیا ہے، اور خدا معلوم، ہم دونوں [illegible] اصل عبارت سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔

شامل ہوں، غالب کے شاگردوں کے علاوہ اور کسی کی نہ ہوں۔ ہاں اگر اس دوران میں کچھ اور اصحاب بھی مرحوم سے اپنی مودّت اور ارادت کے اظہار کے لیے، اس کمیٹی کے پاس کوئی تحریر بھیج دیں، تو اسے بھی مجموعے کے آخر میں شامل کر لینا چاہیے۔ کتاب غالب کی تصویر سے مزیّن ہوگی؛ اور اس میں ان کے شاگردوں کی مکمل فہرست دی جائیگی۔ ہر ایک شاگرد کو اور عطیہ دینے والے کو کتاب کا ایک نسخہ بلا قیمت پیش کیا جائے، اور بقیہ کتابیں فروخت کر دی جائیں۔
اگر میری یہ تجویز قابلِ قبول ہو، تو اس سے غالب کے شاگرد اپنے جلیل القدر استاد سے اپنی عقیدت کے اعتراف کی کھلی شہادت پیش کر سکینگے۔ اور یہ عظیم ادبی مجموعہ بھی غالب کے اپنے دواوین کے ساتھ ان کی یادگار کے طور پر زندۂ جاوید رہیگا۔
بہرحال، میں نے جو کچھ عرض کیا، اگر مجوزہ کمیٹی، ہندستان کے اس نامی شاعر کی دوامی یادگار کے لیے، جو ہم سے کھو گیا ہے، کوئی اس سے بہتر ذریعہ بتا سکے، تو یہ اور بھی خوشی کا باعث ہوگا۔

محمد مردان علی رعنا
شاگردِ غالب

اس مراسلے کا تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ رعنا کی تجویز کے اجزاے ترکیبی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سوانح عمری
۲۔ غالب کے شاگردوں کی نظمیں اور مضامین
۳۔ شاگردوں کے لکھے ہوئے قطعاتِ تاریخ، مرثیے وغیرہ
۴۔ شاگردوں کی مکمّل فہرست اور ان کا مختصر تذکرہ
۵۔ غالب کی تصویر
۶۔ آخر میں وہ مضمون جو (شاگردوں کے علاوہ) کوئی اور ارادتمند لکھنا چاہے

بیشک، یہ کام نہ کم تھا، نہ کسی ایک شخص کے بس کی بات: تاہم اس میں بھی شبہہ نہیں ہے کہ قابلِ عمل تھا۔ لیکن، افسوس کہ کسی نے اس مفید تجویز پر دھیان نہ دیا۔ اس وقت غالب کے بیشتر پرانے شاگرد اور ملنے والے زندہ تھے۔ اگر وہ استاد کے حالات قلمبند کر دیتے، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج جو ہم ان کی حیات کی گئی کڑیاں ملانے کے لیے سرگرداں ہیں، تو اس سے کتنی سہولت ہو جاتی۔ لیکن اب افسوس عبث ہے۔ یہ مفید کام نہ ہو سکا۔

مدّتوں بعد مولانا محمد علی مرحوم نے کامریڈ، کلکتہ کی اشاعت ۱۷ جون ۱۹۱۱ء میں ایک مضمون لکھا کہ

۱۔ مزارِ غالب کے اوپر ایک مناسب میموریل تعمیر کیا جائے
۲۔ مستند سوانح غالب مرتب کی جائے۔
۳۔ غالب کی نظم و نثر کا ایک اچھا اڈیشن شائع ہو
۴۔ غالب سوسائٹی قائم کی جائے
۵۔ مختلف علمی اداروں میں غالب لیکچر شپ کا انتظام ہو

اس کے ساتھ ہی انھوں نے مزار کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل کی۔ ملک کی طرف سے اس کی پذیرائی کس گرمجوشی سے ہوئی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۷ جون ۱۹۱۱ء سے ۲ دسمبر ۱۹۱۱ء تک کے، تقریباً چھ مہینوں میں کل ۶۷۷ روپے جمع ہوئے۔ اس کارِ خیر میں بعض چندہ دینے والے حسبِ ذیل حضرات تھے:

		روپے
مولانا محمد علی، کلکتہ	:	۲۵
حامد علی خان بیرسٹر، لکھنؤ	:	۳۰
مولانا شوکت علی	:	۱۰
مولانا ابوالکلام آزاد	:	۱۰
مرزا محمد عسکری، لکھنؤ	:	۱۰
سیٹھ یعقوب حسن، مدراس	:	۱۰
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، الہ آباد	:	۵۰
محمد یحییٰ تنہا، میرٹھ	:	۱
مولانا الطاف حسین حالی	:	۱۰
قاری سرفراز حسین، دلی	:	۱
کاشی پرشاد جلیسوال، کلکتہ	:	۳
نواب محمد سعید خان طالب، دلی	:	۲۵
نواب غلام احمد کلامی، مدراس	:	۱۰

لیکن اب ایک اور پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ مولانا محمد علی نے یہ تجویز اور اپیل جس دلسوزی اور خلوصِ نیت سے کی تھی، وہ ظاہر ہی ہے۔ لیکن اس پر "غالب کے بعض اعزہ" چونکے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قبر کی مرمت وہ خود کرائینگے ..... نیز اس کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مرحوم کے اعزہ یہ گوارا نہیں کرینگے کہ ان کے جلیل القدر بزرگ کے مزار کی تعمیر عوامی چندے سے ہو۔" لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔[۵]

بہر حال مقامِ افسوس ہے کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مولانا محمد علی کچھ نہ کر سکے کیونکہ ملک کی سرد مہری کے باعث کافی رقم ہی نہیں جمع ہو سکی تھی۔ ادھر "غالب کے اعزہ" میں کون شخص تھا، جو اکیلا پورا خرچ برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ "سانجھا باپ نہ پیٹے کوئی" کے مصداق کسی نے بھی کچھ نہ کیا۔

اتنے میں مرورِ زمانہ سے مزار کی حالت خستہ سے خستہ تر ہوتی چلی گئی۔

۲

۱۹۵۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کے دل میں پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ دلّی میں غالب کی ایک یادگار تعمیر کی جائے، جو اس اردو اور فارسی کے عظیم الشان شاعر کے بھی شایانِ شان قرار دی جا سکے، اور اس کے مدّاحوں اور نام لیواؤں کے لیے بھی باعثِ اطمینان و فخر ہو۔ مولانا آزاد اس زمانے میں وزیرِ تعلیم حکومتِ ہند تھے؛ اور سر شانتی سروپ وزارتِ تعلیم کے سکتر۔

پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک "غالب میموریل ہال" بنایا جائے۔ جہاں وقتاً فوقتاً نہ صرف ادبی اجتماع اور مشاعرے ہی منعقد ہو سکیں، بلکہ اگر کسی اور سماجی اور تہذیبی ادارے کو بھی ضرورت پیش آئے، تو اسے بھی اس کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈاکٹر بھٹناگر مرحوم نے اپنے چند ہمخیال دوستوں کا ایک جلسہ طلب کیا۔ یہ اجتماع ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ اس میں مندرجۂ ذیل حضرات موجود تھے:۔

---

۵ یہ ساری تفاصیل ماخوذ ہیں مضمون "غالب کی یادگار قائم کرنے کی اوّلیں کوششیں" سے۔ دیکھیے، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا تحقیقی رسالہ "اردوئے معلّیٰ" غالب نمبر حصۂ سوم (شمارہ ۱۰): ۳۴۳ - ۳۷۰

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر	:	سکتر، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند، نئی دلی
شنکر پرشاد صاحب	:	چیف کمشنر، دلی
ودّیا شنکر صاحب	:	جائنٹ سکتر، وزارت دفاع، حکومت ہند، نئی دلی
جناب جوش ملیح آبادی	:	مدیر ماہنامہ "آج کل"، دلی
کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب	:	ہاؤسنگ وریٹ کمشنر، دلی
سید اشفاق حسین صاحب	:	ڈپٹی سکتر، وزارتِ تعلیم، حکومت ہند، نئی دلی
جناب شیو راج بہادر	:	دلی
حمیدہ سلطان صاحبہ		دلی

اس جلسے میں یہ فیصلہ ہوا کہ ضروری روپیہ جمع کیا جائے، جس سے مجوزہ ہال تعمیر ہو سکے۔ خرچ کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ کا تھا۔ چنانچہ اس پر تمام حاضرین نے اپنے حلقۂ احباب سے روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ سید اشفاق حسین صاحب باتفاق رائے خزانچی مقرر ہوئے۔

کچھ دن تک کام اس نہج پر ہوتا رہا۔ جو رقوم جمع ہوئیں، وہ "غالب میموریل فنڈ" کے حساب میں لائیڈز بنک، نئی دلی میں جمع ہوتی رہیں۔ لیکن جلد ہی سب نے ان تمام مساعی کو کسی منظم ادارے کے سپرد کر دینے کی ضرورت محسوس کی۔ لہٰذا طے پایا کہ "غالب سوسائٹی" قائم کی جائے، اور اسے باقاعدہ رجسٹر کرا لیا جائے۔ چنانچہ اس کے قواعد و ضوابط بنائے گئے۔ اور سوسائٹی کی تشکیل اور ان قواعد پر غور و خوض کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل اصحاب سے ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء کو جمع ہونے کی درخواست کی گئی:

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر	:	سکتر، وزارتِ تعلیم، حکومت ہند، نئی دلی
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	:	وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ
جناب شنکر پرشاد صاحب	:	چیف کمشنر، دلی
جناب ودّیا شنکر صاحب	:	جائنٹ سکتر، وزارتِ دفاع، حکومت ہند، نئی دلی
بیگم ساجدہ سلطانہ صاحبہ آف پٹودی	:	نئی دلی

نواب زین یار جنگ بہادر	:	حیدر آباد
جناب جوش ملیح آبادی	:	مدیر ماہنامہ "آج کل" دلی
جناب برج نرائن صاحب	:	دلی
جناب تیوراج بہادر صاحب	:	دلی
سید اشفاق حسین صاحب	:	ڈپٹی سکتر، وزارت تعلیم، حکومت ہند، نئی دلی

ان میں سے بیگم صاحبہ ٹپودی اور نواب زین یار جنگ بہادر اور جوش ملیح آبادی اس جلسے میں نہیں آسکے تھے۔ انھوں نے غیر حاضری کے لیے معذرت کی، اور لکھ بھیجا کہ اجتماع میں جو فیصلہ ہوگا، اسے ہم منظور کرتے ہیں، اور مزید یہ کہ ہمیں اس سوسائٹی کا اساسی رکن بننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔

جلسے میں یہ قرار داد منظور ہوئی:

> میرزا اسداللہ خان غالب کی یادگار کو دوامی شکل دینے کے مقصد سے "غالب سوسائٹی" کے نام سے ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے۔ اس کے لیے فوری کارروائی کی جائے، تاکہ غالب کی قبر کی مرمت ہو سکے اور اس پر ایک موزوں عمارت بنائی جائے۔ مزید یہ کہ اس کی یاد میں ایک ہال تعمیر کیا جائے۔

اس جلسے میں سید اشفاق حسین صاحب نے حاضرین کو مطلع کیا کہ لینڈ ڈولپمنٹ آفیسر (Land Development Officer) نے مجوزہ ہال تعمیر کرنے کے لیے بستی نظام الدین میں زمین کا ایک ٹکڑا مخصوص کر دیا ہے۔ جونہی سوسائٹی کی رجسٹری ہو جاتی ہے، اس جگہ کے حصول کے لیے باضابطہ درخواست دے دی جائیگی۔ اس کے بعد سوسائٹی کی مجلسِ منتظمہ کا حسبِ ذیل انتخاب ہوا:

صدر	:	ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر صاحب
سکتر	:	سید اشفاق حسین صاحب
خزانچی	:	جناب دتّیا شنکر صاحب
اراکینِ مجلسِ عاملہ	:	بیگم صاحبہ پاٹودی؛ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب؛ جناب شنکر پرشاد صاحب؛ نواب زین یار جنگ بہادر؛ جناب جوش ملیح آبادی؛

جناب تیوراج بہادر صاحب؛ جناب برج نارائن صاحب۔
لیکن جناب دیا شنکر صاحب خزانچی کا عہدہ سنبھال بھی نہیں سکے تھے کہ ان کا تبادلہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے پالن پور (بمبئی) ہوگیا۔ اس لیے اس کے بعد جناب برج نارائن صاحب کو خزانچی بنایا گیا۔ اب تک تمام وصول شدہ رقوم لائیڈز بنک، نئی دلی میں "غالب میموریل فنڈ" کے حساب میں جمع ہوتی رہی تھیں۔ جب سوسائٹی کی باقاعدہ تشکیل ہوگئی تو حساب مذکور کا نام بھی بدل کر "غالب سوسائٹی" کر دیا گیا۔
نواب زین یار جنگ بہادر (حیدر آباد) ہندستان کے مایۂ ناز ماہر فن تعمیر (Architect) تھے۔ انھوں نے مجوزہ مقبرے اور ہال کے نقشے تیار کیے۔ روپے کی فراہمی کا کام تو ہو ہی رہا تھا، سوسائٹی کے سکریٹری کی درخواست پر پورن چند صاحب ایگزیکیٹو انجینیر، محکمۂ تعمیرات ہند نے کام کی دیکھ بھال کے لیے اپنی اعزازی خدمات پیش کر دیں۔ چنانچہ تعمیر کا تمام کام انھیں کی نگرانی میں ہوا۔ سوسائٹی کا تخمینہ یہ تھا کہ مجوزہ نقشے کے مطابق قبر پر سنگِ مرمر کی چوکھنڈی بنانے پر ۱۳،۱۹۷ روپے کا خرچ اٹھیگا۔ اس کی تیاری کے لیے چھہ مختلف فرموں نے ٹنڈر پیش کیے۔ ان میں سے مسرز عبدالحکیم حسین بخش، مکرانہ (راجستھان) کا ٹنڈر سب سے ارزاں تھا۔ یہ فرم راجستھان میں سنگ مرمر کا کاروبار کرتی ہے۔ انھوں نے یہ کام ۱۱،۲۸۷ روپے ۳ آنے، یعنی سوسائٹی کے تخمینے سے ساڑھے چودہ فی صد کم پر مکمل کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ ان کا ٹنڈر منظور کر لیا گیا۔
فرم نے مجوزہ نقشے کے مطابق سنگ مرمر کی منقش تختیوں اور جالیوں کی تیاری کا کام اپنے کارخانے (مکرانہ) ہی میں کیا۔ انھوں نے جون ۱۹۵۴ء میں کام شروع کیا تھا، اور سب چیزیں اکتوبر ۱۹۵۴ء کے آخر تک تیار ہوگئی تھیں۔ ٹھیکے کی رُو سے انھیں چوکھنڈی ۱۰ نومبر ۱۹۵۴ء تک مکمل کر دینا چاہیے تھی۔ لیکن بوجوہ یہ کام دسمبر ۱۹۵۴ء میں ختم ہوا۔
افسوس کہ سوسائٹی کے سرگرم صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کو اپنی مساعی کو پوری طرح بار ور ہوتے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے ۹ جنوری ۱۹۵۵ء کو سوسائٹی کا ایک فوری جلسہ بلایا گیا۔ جس میں تعزیتی قرارداد کی منظوری کے بعد جناب شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر سوسائٹی کے نئے صدر چنے گئے۔

چوکھنڈی کی تعمیر کا کام غالب کے یومِ وفات ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء سے پہلے ختم ہوگیا، اور اس کے افتتاح کی رسم اسی دن ادا ہوئی۔ اچھے خاصے پیمانے پر ایک جلسہ چوسٹھ کھمبا کے کھلے مشرقی میدان میں ہوا۔ اس جلسے میں نظمیں پڑھی گئیں، اور دو تین تقریریں بھی ہوئیں۔

غالب کی قبر پہلے اس ہڑواڑ میں تھی، جو ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اتفاق سے یہ قبر ہڑواڑ کے احاطے کی مغربی دیوار کے پاس تھی۔ اس لیے اسے قبرستان سے الگ کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ سوسائٹی نے مزید احتیاط سے کام لیا اور نواب صاحب لوہارو سے اسے الگ کرنے کی اجازت طلب کی۔ موصوف نے نہ صرف اجازت ہی دے دی، بلکہ ۱۰۱ روپے کا عطیہ بھی عنایت فرمایا۔ غالب کے بالکل برابر میں مشرقی جانب ان کی بیوی امراؤ بیگم کی قبر ہے۔ چنانچہ ان دونوں قبروں کو احاطے کی دوسری قبروں سے علیحدہ کرنے میں کوئی الجھن نہیں ہوئی۔ ایک دیوار احاطے کے بیچوں بیچ شمال سے جنوب تک کھینچ دی گئی، جس سے بقیہ احاطہ بھی جوں کا توں قائم رہا اور یہ دونوں قبریں بھی الگ ہوگئیں۔ البتہ غالب کی پائنتی کی طرف میرزا زین العابدین خاں عارف کی قبر سوسائٹی نے اس طرف نہیں لی، اور اسے بدستور پہلے احاطے ہی میں چھوڑ دیا۔

اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ اس سے پہلے قبرستان کے احاطے کا دروازہ شمالی سڑک پر تھا، جس سے آنے جانے والے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن جب غالب کی قبر الگ ہوگئی، تو ظاہر ہے کہ اب اس کے لیے پرانا دروازہ استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ اور مزارِ غالب کے نئے احاطے کی سڑک والی مختصر دیوار میں کافی جگہ نہیں تھی کہ وہاں ایک اور دروازہ نصب کیا جا سکے، جس سے زائرین قبر تک آسانی سے پہنچ سکتے۔ اس کے علاوہ مزار کے ساتھ بھی تو ایک مناسب صحن کا ہونا لازم تھا۔ اس قبر کے مغرب میں ایک مکان تھا۔ پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ اس کے مالک تین اشخاص ہیں۔ ان میں سے دو پاکستان چلے گئے ہیں، اور ایک ہنوز دلّی میں مقیم ہیں۔ جو صاحب ابھی تک یہاں تھے، انھوں نے بطیبِ خاطر اس کارِ خیر کے لیے اپنا حصہ سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ بقیہ دونوں مالکوں کا حصہ سوسائٹی نے ۱۴۴۲-۱۰-۸ روپے دے کر کسٹوڈین سے خرید لیا۔ سوسائٹی نے اس مکان کے

کمرے اور دالان مسمار کر کے مزار کے سامنے ایک کشادہ صحن تیار کر دیا، اور پتھر کا فرش لگ گیا۔ یوں سڑک کی طرف کی دیوار میں دروازے کی جگہ بھی نکل آئی۔

سوسائٹی کا ارادہ یہ تھا کہ غالب کے نام پر ایک یادگار ہال بھی تعمیر کیا جائے، بلکہ شروع میں تجویز ہی ہال کی تھی۔ چوں کہ روپیہ بہت کم جمع ہو سکا، اس لیے مجوزین نے مقبرے کی چوکھنڈی ہی پر قناعت کر لی۔ اس وقت ہال پر کم و بیش دو ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوتا۔ سوسائٹی کی مالی حالت اتنے کثیر اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے ہال کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سوسائٹی نے جو کچھ جمع کیا تھا، اس میں حکومت سے ایک پائی نہیں لی گئی۔ ذیل میں بعض اہم چندہ دینے والوں کی مختصر فہرست دی جاتی ہے۔ اس میں ایک اور بات یاد رہے کہ جو رقم جمع کی گئی، وہ بڑی حد تک چھوٹے چھوٹے چندوں پر مشتمل تھی۔

سیٹھ گھنشام داس برلا صاحب، دلّی	۱۵،۰۰۰
شنکر لال خیراتی ٹرسٹ، دلّی	۳،۰۰۰
فرسالال مان سنگھکا صاحب، بھلادرا، (راجستھان)	۱،۰۰۰
دلّی کلاتھ ملز، دلّی	۱،۰۰۰
لالہ یودھ راج صاحب، دلّی	۱،۰۰۰
نواب صاحب لوہارو، جے پور	۵۰۱
لالہ بھرت رام صاحب، دلّی	۵۰۰
لالہ چرت رام صاحب، دلّی	۵۰۰
شیو راج بہادر صاحب، دلّی	۵۰۰
رام ناتھ چٹیار صاحب	۵۰۰
پی۔ سنگھانیا صاحب، کانپور	۵۰۰
ایل۔ ایم جتاے صاحب	۵۰۰
ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر صاحب، دلّی	۵۰۰
نواب صاحب پالن پور،	۵۰۰
بیگم صاحبہ پاٹودی، دلّی	۲۰۰

آر۔ این ہکسر صاحب، دلّی	۲۰۰
شیام نندن سہاے صاحب	۱۵۱
راے اما ناتھ بالی صاحب، لکھنؤ	۱۰۱
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، دلّی	۱۰۰
پروفیسر محمد حبیب صاحب، علی گڑھ	۱۰۰
جناب سلطانہ آصف فیضی صاحبہ، بمبئی	۱۰۰
جناب آصف علی اصغر فیضی صاحب، بمبئی	۱۰۰
سجّاد مرزا صاحب، حیدر آباد	۱۰۰
برج نارائن صاحب، دلّی	۱۰۰
مہارانی صاحبہ، جہانگیر آباد	۱۰۰
ہری چرن داس صاحب	۱۰۰

دنیاے علم و ادب ان سب اصحاب کی شکر گزار رہیگی کہ انھوں نے اس اہم قومی کام کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا۔

آزاد بنام غالب

یہ بات اب قاعدۂ کلیہ کی حیثیت اختیار کرچکی ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد ہمارے صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز ہیں؛ ان کا اسلوب تحریر بیحد دلکش اور دلفریب ہے، جس کا تتبع ممکن نہیں۔ یہ سب درست، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قاری بالعموم ان کی زبان کے چٹخارے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ ان کی بعض دوسری خصوصیات کی طرف اس کا خیال جاتا ہی نہیں۔ آزاد کی نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریر بہت پہلو دار ہوتی ہے۔ وہ عام طور پر اعتراض یا نکتہ چینی صاف کھل کر نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی چوٹ سیدھی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پہلو سے وار کرتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کے فقروں کے دروبست اور انشا کی رنگینی میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ، اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انھوں نے کہاں سے چٹکی لی۔ اس مضمون میں ان کے غالب پر اعتراضات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

(۱) مولانا آزاد کی نظر میں غالب دراصل اردو کے نہیں، بلکہ فارسی کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ ان کے نام کا "آب حیات" میں شمول بیجا ہے، جو اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا ان کا حال شروع ہی ان الفاظ سے کرتے ہیں[۱]:

> میرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا، اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں، اور جس طرح امراد رؤسائے اکبر آباد میں علوِ خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اردوئے معلّٰی کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جائے۔

یہاں مولانا آزاد دو باتوں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں:

(الف) ان کا اصلی شوق نظم و نثر فارسی کا تھا اور وہ میرزائے فارسی ہیں۔ گویا اردو سے تعلق محض

۱۔ آب حیات: ۶۲۵

ثانوی تھا۔

(ب) "امرا و رؤسائے اکبرآباد میں علوِ خاندان سے نامی ہیں"، امیر زادہ اور رئیس زادہ، اور وہ بھی دتی کا نہیں، بلکہ آگرے کا۔ مقصود یہ ہے کہ رئیس ہو نگے، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ شاعر بھی بڑے ہیں، جب کہ وہ زبان کے مرکز دتی میں پیدا بھی نہیں ہوئے، بلکہ آگرے میں۔

(ج) شاید یہ بھی کہنا چاہتے ہوں کہ اگر عالی خاندان بھی ہیں، تو آگرے میں۔ یہاں دتی میں انھیں کون پوچھتا تھا! یاد رہے کہ "آب حیات" غالب کی وفات کے بعد شائع ہوئی اور غالب کی ساری عمر دتی میں گزری تھی۔

(۲) ان کی فارسیت کو انھوں نے پھر دہرایا ہے اور یہاں ایک اور چٹکی لی ہے۔ فرماتے ہیں[۲]:

> اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے، مگر علومِ درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی۔ اور حق پوچھو، تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اُٹھ جائے، اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہنچائے۔

یہاں پھر اسی پہلی بات کا اعادہ کیا ہے۔ لیکن "اہلِ ہند میں" کے تین لفظی اضافے سے یہ بتایا ہے کہ بیشک وہ فارسی کے باکمال شاعر تھے، لیکن اہلِ ہند کی حد تک؛ اہلِ ایران کے مقابلے میں وہ کسی شمار قطار میں نہیں۔

لیکن ایک اور وار یہ کیا ہے کہ نہ ان کی تعلیم معروف اور منظم طریقے پر ہوئی، نہ انھیں بزرگوں کی نگرانی اور تربیت میسر آئی۔ اس لیے سب کچھ ناقص اور ادھورا رہ گیا۔ گویا جہاں تک ان کے امیر زادہ ہونے کا تعلق ہے، بجا و درست؛ لیکن تعلیم و تربیت کا خانہ خالی ہے، اور اُس پہلو سے انھیں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔

(۳) دیوانِ اردو سے متعلق فرماتے ہیں[۳]:

> اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں، اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر؛ مثنوی ۳۳ شعر؛ متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر؛ رباعیاں ۱۶؛ دو

۲- ایضاً: ۶۳۰-۶۳۱

۳- ایضاً: ۶۴۳

نار یخیں جن کے ہم شسر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

یہ شعر شماری بمقصد نہیں، بلکہ بتا رہے ہیں کہ حضرت کی اوقات ہی کیا ہے، کس برتے پر تتا پانی۔ آخری فقرے سے کہیں کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ غالب کی بلند خیالی اور جدتِ مضامین کی مدح سرائی کر رہے ہیں؛ بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کلام (اور وہ بھی اکثر) ان کا بمعنی ہے، جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ یہ وہی بات ہے، جو ان کے استاد حکیم آغا جان عیش نے بر سرِ مشاعرہ، غالب کو مخاطب کر کے، اس قطعے میں کہی تھی۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے، تو کیا سمجھے ۔۔۔ مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے، اور زبانِ میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا، یہ آپ سمجھیں، یا خدا سمجھے

(۴) پھر کلام کے نقائص سے متعلق ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں[4]:

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی، ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے، چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی، اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں، وہ ایسے ہیں، کہ جواب نہیں رکھتے۔

یہاں کلام کے دو نقص گنوائے ہیں۔ پہلا تو وہی، جو اوپر بیان ہوا کہ "ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے"۔ لیکن دوسرا اعتراض اس سے اہم تر ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں کہ "اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے ہیں کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں"، تو اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ وہ غلط زبان اور محاورے اور روزمرہ کے خلاف اردو لکھتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں انھوں نے آگے اردوئے معلی کے خطوط سے متعلق لکھتے ہوئے دی ہیں۔

(۵) یہاں تک تو نظم کا بیان تھا۔ اب ذرا نثر کا بھی سن لیجیے، جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ نئی اردو کا بانی بلکہ موجد غالب ہے اور "اردوئے معلی"، اس "دین" کی ایزدی کتاب ہے۔ اردوئے معلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[5]:

۴۔ ایضاً: ۴۴۴ ۔۔۔ ۵۔ ایضاً: ۴۴۸

اس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اردوئے معلّٰی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے کہ گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوشنما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصّع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تو وہ جانیں؛ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

— کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔

— اب، وررنگ وروزی کی تقصیر معاف کیجیے۔

— پس چاہیے کہ کوئل کی آرامش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا

— یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔

— سرمایۂ نازشِ قلمروِ ہندستان ہو۔

یہ تو انھوں نے یونہی انکسار سے لکھ دیا کہ "بعض فقرے کم استعداد ہندستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تو وہ جانیں؛ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے"۔ دراصل یہاں پھر انھوں نے ہجوِ ملیح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، یہ اردو نہیں، بلکہ فارسی ہے اور اردو دان فارسی ترکیبوں اور تراشوں کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی انھیں سمجھتا ہی ہے۔

(۶) اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

بعض جگہ خاص محاورۂ فارسی کا ترجمہ کیا ہے، جیسے میر اور سودا وغیرہ کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انھیں خطوں میں فرماتے ہیں: "اس قدر عذر چاہتے ہو" یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ "عذر خواستن" جو فارسی کا محاورہ ہے، وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔ "بہ نظر اس دستور پر، اگر دیکھو تو مجھے اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں" یہ بھی ترجمہ "بہ نظر بریں ضابطہ" کا ہے۔ "منشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں" "گلہ ہا دارند شکوہ ہا دارند" فارسی کا محاورہ ہے۔ "کیوں بہا راج، کول میں آنا، منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی ادام کو یاد نہ لانا" "یاد آوردن، خاص ایران کا سکہ ہے، ہندوستانی "یاد کرنا" بولتے ہیں۔

یہاں انھوں نے صاف صاف نہ صرف یہ بتایا ہے کہ غالب کن فارسی محاوروں کا ترجمہ کر رہے

ہیں، بلکہ ان کی اصلاح بھی کر دی کر ٹھیک اردو محاورہ کیا ہے، جسے وہ اپنی اردو سے ناواقفیت کی بدولت استعمال نہ کر سکے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فارسی محاوروں کا ترجمہ میر و سودا کے زمانے تک تو جائز تھا کہ زبان ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی؛ اس میں الفاظ اور محاورات کا ذخیرہ ناکافی تھا۔ لیکن اب یہ عذر قابلِ قبول نہیں۔ اب ٹھیک روزمرے کے مطابق لکھنا چاہیے۔

(۷) خطوں کے طرزِ نگارش سے متعلق ارشاد ہوتا ہے[۷]:

> خطوں کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطائف کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انھیں کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے، دوسروں کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملاتِ خاص میں مراسلے لکھے، تو اس انداز میں ممکن نہیں۔

مولانا آزاد کا مدعا یہ ہے کہ اردوے معلیٰ کی زبان صرف بات چیت اور خط و کتابت (اور وہ بھی غیر سنجیدہ موضوع ہی) تک کارآمد ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان میں کسی اہم موضوع، تاریخ، یا اخلاق، یا کسی خاص علم کا بیان کرنا چاہے، تو یہ زبان اس طرح کے مفہوم کے ادا کرنے میں قاصر رہیگی۔

(۸) پھر اسی پر بس نہیں کرتے۔ عام خیال ہے، اور یہ ہے بھی درست کہ، اردوے معلیٰ کے خطوں کی زبان، ان کا نکھا ہی انداز، اور بیساختہ پن ایسا ہے کہ انسان اگر انھیں پڑھنا شروع کرے، تو بے تکان پڑھتا ہی چلا جائے اور اس کی سیری نہ ہو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں[۷]:

> پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے، اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے، اور طرفین کے ذاتی معاملات سے، بخوبی واقف ہو، غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لیے اگر ناواقف اور بیخبر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے، تو کچھ تعجب نہیں۔

گویا وہی خصوصیت جو میرزا کے خطوں کا طرۂ امتیاز ہے، یعنی ان کی بیتکلفی اور بیساختگی، آزاد کے نزدیک کسی توجہ کے لائق نہیں۔

۶- ایضاً: ۶۴۹

۷- ایضاً

(۹) اس کے بعد میرزا کی بعض زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کتاب میں قلم، التماس کو مؤنث، پنشن، بیداد، بارک کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔"

یوں معلوم ہوتا ہے کہ "قلم" غالب کے زمانے تک، مؤنث بھی لکھتے تھے۔ ظفر کا شعر ہے:

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں   تو دل کچھ اور کہتا ہے، قلم کچھ اور کہتی ہے

بلکہ اگر خود مولانا آزاد کا اعتبار کیا جائے، تو یہ شعر ظفر کا نہیں، بلکہ ان کے اپنے استاد ذوق کا ہے کیونکہ یہ ظفر کے دیوانِ سوم میں ہے۔ "التماس" دلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مؤنث ہے۔ انگریزی لفظوں کی تذکیر و تانیث کا اس زمانے تک تعین ہی کہاں ہوا تھا کہ اس پر اعتراض ہو؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آج تک اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ متعین نہیں ہوا۔ ایک ہی لفظ کو کوئی مذکر لکھ رہا ہے، کوئی مؤنث۔

یہ ہے مولانا آزاد مرحوم کی فردِ جرم غالب کے خلاف۔ اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچینگے کہ

۱۔ غالب دراصل اردو کے نہیں، فارسی کے شاعر تھے؛

۲۔ ان کی تعلیم و تربیت ناقص رہ جانے سے، وہ اس میں بھی صحیح اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے؛

۳۔ اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابلِ فہم یا دوسرے لفظوں میں بےمعنی ہے؛

۴۔ اردو میں وہ غلط محاورہ اور روزمرّہ لکھتے ہیں؛

۵۔ وہ اردو نثر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے ہیں، جو اردو کے اہلِ زبان کے روزمرّہ کے خلاف ہوتا ہے؛

۶۔ ان کی اردو سوائے غیر سنجیدہ تحریر کے اور کسی مصرف کی نہیں؛ اور

۷۔ ان کے اردو خطوط عام قاری کے لیے بےمزہ ہیں۔

اگر مولانا محمد حسین آزاد کی یہ پوری فردِ جرم صحیح ہو، تو کوئی بتائے کہ غالب کو ہم کس لیے پڑھ رہے ہیں؟

۸۔ ایضاً

کتابیات

کتب :

آب حیات — محمد حسین آزاد : سرفراز پریس، لکھنؤ

احوال غالب — مرتبہ۔ مختار الدین احمد (طبع اول) : دہلی پرنٹنگ پریس، دہلی (۱۹۵۳ء)

اردوی معلی — از غالب (بار اول) : مطبع کریمی، لاہور (۱۹۲۲ء)

باغِ دودر از غالب (مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی) (بار اول) : پنجابی ادبی اکیڈیمی پریس، لاہور (۱۹۷۰)

تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی، جلد اول (فرانسیسی) انگارسین دتاسی : مطبع ہنری پلاں، پیرس (۱۸۷۰ء)

تاریخ صحافت اردو، جلد اول — از امداد صابری : جدید پرنٹنگ پریس، دلّی

تلامذۂ غالب — از مالک رام : کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی (۱۹۵۸ء)

خدنگ غدر از معین الدین حسن خان (شعبۂ اردو، دلّی یونیورسٹی) : جمال پرنٹنگ پریس، دلّی (۱۹۷۲ء)

خطوط غالب از غالب (مرتبہ مالک رام) : سرفراز قومی پریس، لکھنؤ (۱۹۶۲ء)

دریائے لطافت از انشا (ترجمہ اردو از برج موہن دتاتریہ کیفی) : مطبع انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (۱۹۳۵ء)

دیوان معروف از الٰہی بخش خان معروف (طبع اول) : نظامی پریس، بدایوں (۱۹۳۵ء)

ذکر غالب از مالک رام (طبع پنجم) : جمال پرنٹنگ پریس، دلّی (۱۹۷۵ء)

سیلیکٹ ہسٹری کلکشنز آف این انڈین آفیشل (انگریزی) از و، ح، سلیمان : آکسفورڈ یونیورسٹی، پریس (۱۹۱۵ء)

زندگانیِ بےنظیر از محمد عبدالغفور شہباز : مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۹۰۰ء)

سبد چین از غالب (مرتبہ مالک رام) : جید برقی پریس، دلّی (۱۹۳۸ء)

سخن شعرا از عبدالغفور نسّاخ : مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۸۷۴ء)

عقدِ ثریا از غلام ہمدانی مصحفی : جامعہ برقی پریس، (۱۹۳۴ء)

عودِ ہندی از غالب (ناشر شیخ مبارک علی) : کریمی پریس، لاہور (؟)

عیار غالب مرتبہ مالک رام : کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی (۱۹۶۹ء)

غالب از غلام رسول مہر (طبع چہارم) : عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور (۱۹۴۶ء؟)

غالب اور شاہانِ تیموریہ از خلیق انجم : کوہ نور پریس، دلی (۱۹۷۴ء)

غدر کی صبح شام مرتبہ خواجہ حسن نظامی : ہمدرد پریس، دلی (۱۹۲۶ء)

قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ از غالب (مرتبہ قاضی عبدالودود) : لکشمی پرنٹنگ ورکس، دلی (۱۹۶۷ء)

قومی دفتر خانۂ ہندوستان دلی کی متعدد دستاویزیں (قلمی) :

کارنامۂ سروری از نواب سرور الملک : مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۱۹۳۳ء)

کلیات شیفتہ و حسرتی مرتبہ نظامی بدایونی : نظامی پریس، بدایوں (۱۹۱۶ء)

کلیات نثر حالی (۱) مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی : زرّیں آرٹ پریس، لاہور (۱۹۶۷ء)

کلیات نثر فارسی از غالب (طبع چہارم) : نولکشور پریس، کانپور (۱۸۷۵ء)

گلِ رعنا (تذکرہ) از سید عبدالحی : مطبع معارف، اعظم گڑھ (۱۳۶۴ھ)

گلِ رعنا از غالب (مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی) : مطبع عالیہ، لاہور (۱۹۶۹ء)

مرقع الور از محمد مخدوم تھانوی : مطبع آگرہ اخبار، آگرہ (۱۸۷۶ء)

مکاتیب غالب از غالب (مرتبہ امتیاز علی خان عرشی) : (۱۹۳۷ء)

نامہ ہای فارسی غالب مرتبہ اکبر علی ترمذی : یونین پرنٹنگ پریس، دلی (۱۹۶۹ء)

نقش آزاد ابوالکلام آزاد : علمی پرنٹنگ پریس، لاہور (۱۹۵۹ء)

واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد : شمسی اسٹیم پریس، آگرہ (۱۹۱۹ء)

یادگار غالب از حالی (مرتبہ مالک رام) : لبرٹی آرٹ پریس، دلی (۱۹۶۱ء)

رسائل و جرائد :

اردو سہ ماہی، دلی : جنوری ۱۹۴۵ء

اردو ادب، علی گڑھ : جولائی ۱۹۵۲ء

اردوئے معلی، دلی : غالب نمبر (۳) — شمارہ ۱۰ اردو نامہ، کراچی (۲۰)، مارچ ۱۹۶۵ء

صادق الاخبار، دلی : ۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ / ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء

علی گڑھ میگزین، علی گڑھ : غالب نمبر ۱۹۴۹ء

معارف، اعظم گڑھ : نومبر ۱۹۵۸ء

نقوش، لاہور : ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) نگار، لکھنؤ : ۱۹۴۲ء

ہماری زبان ہفتہ وار، علی گڑھ : ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء

انشاے غالب
مرتبہ : رشید حسن خاں
صفحات : 148
قیمت : -/62 روپے

عبارت کیسے لکھیں
مصنف : رشید حسن خاں
صفحات : 136
قیمت : -/60 روپے

انارکلی
مصنف : امتیاز علی تاج
صفحات : 184
قیمت : -/60 روپے

ایک چادر میلی سی
مصنف : راجندر سنگھ بیدی
صفحات : 116
قیمت : -/48 روپے

پروفیسر آل احمد سرور
مرتبہ : خلیق انجم
صفحات : 88
قیمت : -/48 روپے

فردوس بریں
مصنف : شرر لکھنوی
صفحات : 180
قیمت : -/60 روپے

آزمائش کی گھڑی
مصنف : سید حامد
صفحات : 136
قیمت : -/60 روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے
ترجمہ : نذیرالدین مینائی
صفحات : 84
قیمت : -/48 روپے

ISBN: 978-81-7587-534-0
9788175875340

₹ 72/-